ایران میں اجنبی

ن۔م۔ راشد

ایران
میں
اجنبی

# ایران میں اجنبی

اور

دوسری نظمیں

ن، م، راشد

گوشۂ ادب، چوک انارکلی لاہور

بار اول ۲۱۰۰

قیمت چار روپے

۱۹۵۷ء



انشا
پریس
لاہور میں
چھپا

# فہرس

## ایران میں اجنبی

[تیرہ قطعے]



## خوابِ سحرگہی

## شباب گریزاں

# تمہید

راشد صاحب۔ یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو یقیناً آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے۔ بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے۔ اور میں فخریہ اسے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا۔ اور اسے بلاوجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا۔ کہ میرا ایک شاگرد اردو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا۔ اور لوگ میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پر اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف المدرسین سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے۔ لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت ہی بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہیں میں کس شوق کے ساتھ لیوائین کی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔ اور ان کو بیچ میں لا کر دزدیدہ اوقات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بحثیں لیوائین کے کیفے ٹیریا میں ہوئی ہیں۔ ایم آپ نے آپ کی شاعری کو سمجھنے سمجھانے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشقبازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک

مکتوب بھی اِس عاشقی میں لکھ ڈالوں۔ اور آپ سے مجھے جو محبت ہے اُس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بے سُود نقادی پر ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو جب بھی اُسے لوگ سُننے کے قابل ضرور سمجھیں۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

---

راشد صاحب۔ وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم اتفاقات شائع ہوئی تھی اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعراء پر لعن طعن برابر ہو رہی تھی۔ اور ان کی قافیہ آزادی اور عروض کی بے راہ روی پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتائے جا رہے ہیں۔ حتّٰے کہ غزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اِس انقلاب میں کئی قوتوں کا ہاتھ ہے۔ جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کریگا لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے۔ ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا۔ جس سے متقدمین بے بہرہ تھے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی۔ اور آپ لوگوں نے وہ اُفق دیکھے جو اُس سے قبل نظروں سے

ادھجل تھے۔ ناممکن تھا کہ آپ کی شاعری ایک نیا انداز فکر اور نئی زبان بلکہ نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہئیت) اپنے ساتھ نہ لاتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی طفیل کتنے نوخیز شاعروں کی ہمّت بڑھی۔ بلکہ راشد کے اسلوب بیان میں تو کچھ ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض معتقدین کچھ زیادہ ہی پی گئے۔ یہ جاذبیت بلکہ جادو فیض میں بھی ہے لیکن فیض کی کئی ادائیں فضائے نظم میں حلول کر جاتی ہیں۔ ہر پتّے اور ہر پھول میں نظر نہیں آتیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چسکا نوجوان شاعر کو بہت جلد پڑ جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بزم میں شمع پہلے کس کے سامنے رکھی جائے۔ نہ اس قسم کا مسابقہ ہی مقصود تھا۔ اس سے تو محض یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے جدید شعرا جو اثر پذیر ہوئے تو ان کے اور آپ کے تصرّفِ نظر کے مابین کیا علاقہ تھا۔

"ایران میں اجنبی" کا عنوان ایک دل چسپ فریب ہے جس کے آپ خود بھی شکار ہوئے۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ قطعے آپ نے یک جا کر دئے ہیں۔ ان میں اس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ جسے عزیز لکھنوی نے نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے۔

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیران ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(داخل ایران ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق و بُعد ظاہر ہے۔ تاہم جس ذہنی اور جذباتی دنیا میں آپ کی شاعری باغ لگاتی ہے۔ وہ ایران سے دُور نہیں۔ بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور نہ ہوگی۔

سعدیؔ اور حافظؔ اور خیامؔ اور رومیؔ اور نظیریؔ کی دنیا میں آپ اجنبی کیونکر ہوتے؟ ایران تو ہمارے شعرار کا رضاعی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اُداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ اُسے ایران (اور عربستان) کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں۔ بلکہ ایک نئی یگانگت کا احساس ہُوا۔ "من وسلوے" میں تو آپ ایران سے درپردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں، اجنبی ہوں نہیں۔

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے رضاعی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں ——

خدائے برتر
یہ داریوشِ بزرگ کی سرزمیں
یہ نوشیروانِ عادل کی دادگاہیں
تصوّف و حکمت و ادب کے نگارخانے . . .

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک عجمی ہوں اور "جانِ عجم" سے ملنے آیا ہوں۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریز کی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے کچھ اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریز دونوں کو بھول گئے۔ اور آپ کے "سیاہ فام" جسم میں ایشیائی روح بیدار ہوئی۔ وہ احساسِ مظلومیت جس سے کم ہی کوئی ہندی

ناآشنا تھا،" اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور" غیر کے بے پناہ بپھرے ہوئے ستم"
نے ایک نئے انداز سے آپ کو بپھرا دیا۔ ایشیائیوں کو آپ نے دیکھا کہ ——

قدیم خواجہ سراؤں کی اک نژادِ کاہل ہیں
اور اپنی اجل کی راہوں پہ تیز گامی سے جا رہے ہیں

تو آپ بے قرار ہو کر للکار اٹھے ——

اِن اُونچے درخشندہ شہروں کی
کوتہ فصیلوں کو مضبوط کر لو!
ہر اک برج و باروپہ اپنے نگہبان چڑھا دو!
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

ایسے چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعے میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں وطنی شاعر بھی ہوئے ہیں۔ اور قومی شاعر بھی۔ اخلاقی بھی اور اشتراکی بھی۔ لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے۔ ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشد نے سیاسیات کا رُخ کیا؟ کیا آپ کی اس نوع کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہلِ مکتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار "سیاسی شاعروں" میں کرنا کورذوقی معلوم ہوتا ہے۔ کسی نازک مزاج کی اس

سے تشفی ہرگز نہ ہوگی۔ کیونکہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے زدبان پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں لیکن آپ کی نظر اور بلندیوں پر پڑ رہی ہے۔ اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں جو محض سیاسیات کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجئے۔ جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا طنز واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ بہ پارہ نظم کی حرارت بڑھتی جاتی ہے۔ بات آمریت اور آمر سے شروع ہوئی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے اور جس کی گرفت جنون کی سی گرفت ہے ——

مگر وہ تیری حد سے گذری ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھے
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا،
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو،
جہاں ہر عقیدے کو تو
اپنے الہام کے شیشہ کور میں دیکھتا تھا،
جہاں ایک چھوٹا سا روزن بھی ایسا نہ تھا
جس میں ملت کے افکار کی اک کرن کا گذر ہو،
اسی کا نتیجہ کہ اک روز
کہنے کو باتیں بہت تھیں

مگر سننے والے کہیں بھی نہ تھے
اور تھے بھی تو کرہ ہو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی نظم کہہ کے ٹال دینا محض کسلِ مذاق ہے۔ یہ تو ایک مرثیہ ہے۔ جو آپ نے خود پسند انسانوں پر لکھا ہے۔ جو خود ہی اپنے زندانی ہو جاتے ہیں۔ اُس ہول کا نقشہ ہے جو انتہائی نخوت کی انتہائی سزا ہے۔

آپ کے نیاز مند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے اور اب تو اِس مجموعے نے دوبارہ اس کی تصدیق کر دی کہ آپ کا مزاجِ شاعری بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے۔ ایک کو الفاظ پر محمول کیجئے دوسری کو جذبات پر۔ گو الفاظ و جذبات کی یہ تمیز محض بغرضِ سہولت ہے۔ اِس پر بہت بوجھ نہ ڈالنا چاہیئے پہلے شوکت کو لیجیئے۔ اِن اساتذہ کو چھوڑ کر جو ٹھیٹھ زبان کے ماہر بھی تھے۔ اور شعر میں اس سے گریز بھی نہ کرتے تھے۔ (بلکہ افسوس کہ بعض اوقات اِسی کو شاعری کے لیئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعرا خصوصاً پنجاب کے اردو شعرا کے ہاں مسکین اور گھریلو الفاظ کم ملتے ہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں، سجاتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیئے اکثر اپنے لغت کو ایران اور عربستان کا جبّہ و دستار پہنا دیتے ہیں۔ سرنگوں بات بھی ہو تو اسے "سرنگوں" کہہ کر اس میں کرّ و فر پیدا کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں یہ شعر جھوم جھوم کے پڑھتا رہا ؎

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر ڈھونڈھتا رہا کہ اس میں عجز و ندامت کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ

عجز جتنا بھی تھا اُس سے لغت کا طنطنہ کہیں بڑھ کر ہے۔ الفاظ ایسے دل کش
ہیں۔ کہ معنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اِس بارے میں اکثر
قدامت پسند ہیں۔ لغت میں کوئی جدّت دکھاتے بھی ہیں تو بس اتنی کہ ولایتِ
ایران سے چند اور الفاظ بطورِ سوغات کے لے آتے ہیں۔ یا اگلے سال کے
فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ
ابھی تک ذات پات کے قائل ہیں۔ کہ جو شودر پیدا ہؤا وہ کبھی برہمن کی برابری
نہیں کر سکتا۔ اور جس لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اُس کی رسائی آستانِ
شعر تک کبھی نہ ہو گی۔ اس سے ہماری شاعری پر کئی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔
جنہیں کھولنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کب تک ہماری
شاعری کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھریں گی۔ اور وہ دن کب آئے گا جب ہمارے
شعراء اپنی زبان کو نوازیں گے۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد جب کہ وہ لوگ جن
کی مادری زبان اردو ہے۔ اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں۔ اور اگر ہندوستان
میں ہیں تو اُن سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم "ہماری اپنی زبان" آئندہ کیا
شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کو ہدف کیوں بنا لوں۔ اِس حمّام میں
ہم سبھی ننگے ہیں۔ غنیمت بلکہ شکر ہے کہ آپ پڑھنے والے کو محض پر جھول تو نہیں
مارتے۔ بلکہ جہاں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں۔ وہاں بھی خون کو گرما ہی دیتے ہیں
چنانچہ مجھے آپ کے "واریوش" اور "دلاک" اور "لباسِ کبودی" اور "لهستان" اور
"کورو ادی" واللہ سب گوارا ہیں۔ بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں۔ کہ آپ
نے بڑے بڑے کوہ قافی الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے
ہیں۔ آپ جب بھی انہیں بلائیں حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور ہر خدمت بجا لاتے

ہیں ——

شکر اور قہوے کے ملفوفِ ارزاں
جو بازار میں انتہائی گراں تھے

اس لئے گوارا ہے کہ اپنی بلند آہنگیوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا فرما سکتے ہیں ——

منو کے آئیں کا ظلم سہتے ہوئے ہر یجن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے وزدِ شبِ زمستاں،
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بیچ ڈالے گا
ہم کو بردہ فروشِ افرنگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے بیسے سے
آج بھی کو رو کرہیں ہم سب،
جواب بھی چاہے
تو روک لے ہم سے نورِ عرفاں

ایسے شعروں سے محروم رہ جانا کسے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدّت تو اِس کی ایک رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے۔

اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ سیاق وسباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوش کہہ لیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے۔ جس میں جوش اور جذبے کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جائے۔ جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو۔ جب شدت اس حد تک پہنچے۔ تو مزا کچھ تلخ ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنی ہی کیاریوں کو روند ڈالتا ہے۔ جیسے بچہ ضد میں آکر چیزیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چوں کہ ہمارے بیشتر جدید شعرا نوجوان ہیں یا جوانی کے زمانے میں انہوں نے نام پیدا کیا اور علاوہ برآں آزادی (سیاسی یا معاشرتی یا فنی) کی پیاس سے ہمیشہ اُن پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے۔ اس لئے اِس معاملے میں آپ تنہا نہیں۔ مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں۔ جن میں اِس شدت پر شاعری غالب آئی۔ اور اِسے اپنے پیمانے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ تہمت میں آپ اِس شدت پر وہ قابو نہ پا سکے۔ جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجے تک جا پہنچی ہے۔ جہاں درشتی سے آپ کا قلم نا آشنا ہوا جاتا ہے۔ "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی۔ کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے اِن نظموں میں باوجود جوش اور جذبے کے شدت کے ہاتھوں گُند ہونے نہیں پایا ——

مرے ہاتھ میں ہاتھ دیدو
مرے ہاتھ میں ہاتھ دیدو
کہ دیکھی ہیں میں نے ہمالہ و الوند کی چوٹیوں پر شعاعیں

میں معنی کی دو تین تہیں ہیں۔ جنہیں شاعر نے جیسے بے ساختگی کے ساتھ دو تین مصرعوں میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اور "درویش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہو گا ——

یہ درویش
جس اب وجد
وہ صحرا کے دیروزکی ریت پر
تھک کے مرجانے والے،
اسی کی طرح تھے
تہی دست اور خاکِ تیرہ میں غلطاں،
جو تسلیم کو بے نیازی بنا کر
ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لئے
بال و پر جانتے تھے،
جنہیں تھی فروغِ گدائی کی خاطر
جلالِ شہی کی بقا بھی گوارا،
جو لاشوں میں چلتے تھے
سکتے تھے لاشوں سے:
"سوتے رہو
صبحِ فردا کہیں بھی نہیں ہے!"
وہ جن کے لئے حرّیت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہارِ شاہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے۔

بھلا حد کی کس کو خبر ہے ؟

"لاشعور" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ بھڑ بھڑنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے! لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اور آخری مصرعے نے اپنی ملائمت سے وہ اثر پیدا کیا جو شدّت سے نہ ہو سکتا۔ اِس مجموعے میں "درویش" کیا بہ اعتبارِ لغت اور کیا بہ اعتبارِ وارداتِ قلب اور مزاجِ شاعری کے حاصل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ "بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں جن میں زیادہ زور کسی کردار کی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے۔ تاکہ اُس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہؤا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت ایکیچ یا انگارے کی سی ہے۔ بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں۔" یہ ہمہ گیری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اِس نئے اسلوب کو جس کے آپ بانیوں میں ہیں ہر طرح آزمایا ہے۔ جس کی مثالیں اِس مجموعے میں جابجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے مکالمے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی کوئی نئی چیز نہیں۔ اور جہاں داستان یا افسانہ ہو وہاں مکالمے سے مفر نہیں۔ لیکن قدما کے مکالمے الف بے الف بے ... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لڑھکتے چلے جاتے تھے ——

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال
دال کرتی تھی عرض یوں احوال

وقس علیٰ ہذا۔ لیکن جدید شاعری میں مکالمہ ایک پیچدار معاملہ ہے جہاں متکلّم کے جذبات، جذبات کے ساتھ لہجے کا نشیب و فراز، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس کی اُلجھن سب کو ایک ساتھ بُننا پڑتا ہے۔ یہ مہم آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی۔ اور آپ نے اسے جا بجا چابکدستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعت مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر نا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے ——

زمستاں کے دن تھے
لگاتار ہوتی رہی تھی سرِ شام سے برفباری
دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے
مگر برف کا رقص سیمیں تھا جاری

. . . . . . . . . .

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بیکراں خامشی چھا گئی تھی
خیابان کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
یخ کے گالوے پھندے سے بن کر لٹکنے لگے تھے
زمین اُن کے بکھرے ہوئے بال و پر سے
کف آلود ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری ——

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پہ کائی

سے کتنی دور نکل گئی ہے!

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں۔ تو لامحالہ براؤننگ یاد آیا۔ اُس کی نظموں میں بھی افسانے۔ اسکیچ۔ خود کلامی مکالمے کہانیاں۔ بغرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے۔ اُسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں۔ جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی۔ اُس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا۔ کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی قوتِ تخلیق بھی ایسی تھی۔ کہ اُبلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر چھوٹے پتھر کو دراننہ دھکیلتی چلی جاتی تھی ؛

نیویارک
۲۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء

"پطرس"

# دیباچہ

"ماورا" کو شائع ہوئے کوئی تیرہ برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں مواد اور ہیئت کے باہمی رشتے پر سیر حاصل بحثیں ہوئی ہیں۔ تاہم ابھی تک بعض قاری جدید شاعری میں عموماً اور آزاد نظم میں خصوصاً اپنے لئے حظ کا سامان نہیں پاتے۔ یا غزل کے مقابلے میں کم پاتے ہیں۔ بعض نقاد بھی ایسے موجود ہیں جو کسی مسلّمہ اصول سے انحراف کے روادار نہیں۔ اس کے باوجود نوجوان شاعروں کے ایک اہم طبقے نے ہیئت سے انحراف کے تجربات کو کامیابی سے اپنایا ہے اور اس سے جدید تصورات کے اظہار اور اردو میں ڈرامائی شاعری کی ترویج کے لئے کام لیا ہے۔

یہ کہنا تو شاید قبل از وقت ہو گا کہ آزاد نظم کے تجربے نے اردو کو

شعر کے ایسے عظیم الشان نمونوں سے روشناس کیا ہے۔ جو مغرب کی بعض زبانوں میں آزاد نظم کے لباس میں ملتے ہیں۔ یا اس سے اُس مرتبے کی شاعری وجود میں آئی ہے۔ جیسی غزل یا مثنوی کی صنف میں خود فارسی یا اردو میں اکثر ملتی ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ہئیت کے مقررہ اصولوں سے انحراف نے اردو شاعری کے گذشتہ جمود کو توڑنے میں مدد دی ہے۔ اور شاعروں کو بیان اور معانی کے وہ نئے راستے سجھائے ہیں جن سے ہماری قدیم شاعری ناآشنا تھی۔

جدید شاعری اور خاص طور پر آزاد نظم اس نئے آہنگ کی مظہر ہے۔ جو موجودہ شاعر کو اس کے اپنے زمانے نے بخشا ہے۔ یہ نیا آہنگ قدیم ماہرین عروض کے مقرر کئے ہوئے اصولوں کے ذریعے نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر جدید شاعر اپنے زمانے میں کئی ایسے تجربات اور مشاہدات سے دوچار ہوا ہے۔ جنہیں ہمیشہ پابند نظم کے ذریعے بیان کرنا آسان نہ تھا۔ لہٰذا اگر جدید شاعر قدیم اصنافِ سخن سے گریز نہ کرتا تو اس کے لئے اپنے نئے تجربات نئے احساس اور نئے آہنگ کو باہم وابستہ کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔

جدید نظم کے بعض قاری جو اس سے مناسب حظ نہیں اٹھا سکتے کسی طرح اعتراض کے سزاوار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر موجودہ زمانے میں رہتے ہوئے بھی غزل اور مثنوی کی دنیا میں بستے ہیں۔ وہ غزل کے ماحول سے صدیوں سے واقف چلے آتے ہیں۔ وہ غزل کے

عشق اس کی سیاست اور اس کے فلسفے سے آشنا ہیں۔ جدید شاعری کے عشق سیاست اور فلسفے سے ابھی اُن کا ربط تازہ ہے۔ جدید شاعر نے تجربات اور مشاہدات کے جو دروازے وا کر دیے ہیں۔ ان کے اندر وہی لوگ پورے طور پر جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ جنہوں نے از خود بھی ان تجربات اور مشاہدات سے کبھی ہم آہنگی محسوس کی ہو۔ پھر نیا شاعر نیا لغت استعمال کرتا ہے۔ جو "فرہنگِ آصفیہ" کا لغت نہیں ہے۔ اس کے الفاظ کے معانی وہ کہاں سے معلوم کریں؟ اگر خود نظم کے اندر وہ معانی موجود ہوں تو بھی انہیں ڈھونڈنے کا یارا کس کو ہو؟ صحیح بات یہ ہے کہ قاری ہو یا نقاد جب تک وہ شاعر کے ساتھ ایک حد تک ہم سفر ہونے پر آمادہ نہ ہو اُس کی زبان یا اس کے مزاج سے واقف نہیں ہو سکتا۔ وہ نقاد جن کا علم اور ذوق" بحر الفصاحت" یا "چہار مقالے" کے راستے ان تک پہنچا ہے۔ وہ جب تک اپنے علم کو تھوڑا سا فریب نہ دیں یا ایک حد تک اپنے علم کی شکست کا اعتراف نہ کریں کبھی جدید شاعری کی کماحقہٗ ترجمانی نہیں کر سکتے۔ جدید شاعری پر یہ اعتراض صحیح ہے کہ یہ سب کی شاعری نہیں۔ بے شک یہ ہر شخص کی شاعری نہیں یہ صرف اس شخص کی شاعری ہے۔ جس کا شعور نیا ہو۔ جس کے تجربات اور مشاہدات نئے ہوں۔ اور جس کی ترتیب میں نئے علم، ذوق اور احساس کا کوئی عنصر موجود ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ہمارے ایک سخت جان نقاد نے ایک مرتبہ بعض

جدید شاعروں کی چند بے قافیہ نظمیں لے کر اُن کے مصرعے "ہموار" کرنے اور ان میں قافیہ ڈالنے کا شاندار تجربہ کیا تھا۔ اور اس کے بعد اپنے آپ کو اس تجربے کی کامیابی پر جی بھر کر مبارک باد بھی دی تھی۔ یہ کہنا تو مشکل ہے۔ کہ ہر آزاد نظم جو اب تک اردو میں لکھی گئی ہے اپنے اندر ہیئت سے انحراف کا جواز رکھتی ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص کسی آزاد نظم کے مصرعے ہموار کرنے یا اس میں قافیہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل شعر کے تخلیقی عمل سے پورے طور پر بہرہ ور نہیں۔ کسی آزاد نظم کے ساتھ اس نا روا سلوک سے کچھ بھی تو ثابت نہیں ہوتا۔ مقفیٰ نظم کی برتری بھی تو ثابت نہیں ہوتی۔ حالانکہ ایک طرزِ سخن کی دوسری طرزِ سخن پر برتری ثابت ہو جانے سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض لوگوں نے ناول کو مختصر افسانہ اور مختصر افسانے کو ناول بنانے کے تجربات کئے ہیں۔ یہ تجربات دلچسپ ضرور ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ناول مختصر افسانے سے یا مختصر افسانہ ناول سے بہتر ہے۔ بیکار بات ہوگی۔ دونوں کی پہنائی اور رسائی میں فرق ہے۔ دونوں ذہن کے الگ الگ تار ہلاتے ہیں۔ اسی طرح مقفیٰ نظم اور آزاد نظم کی پہنائی اور رسائی میں فرق ہے۔ اور دونوں کی تاثیر مختلف نوعیت کی ہے۔ جو نقاد اس قسم کے تجربے کرتے ہیں ان کا مقصد کسی نظم یا کسی ادبی پارے کی تقویم ( EVALUATION ) کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ غالباً اپنے علم کی فوقیت جتانا ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی

ادبی پارے کا ایک لباس بدل کر اُسے دوسرا پہنانے سے لازماً اس کے حسن یا تاثیر یا مرتبے میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا۔

تاہم جدید شاعری محض صناعی نہیں یا قدیم صناعی سے انحراف کی فسوں گری کا نام نہیں ہے۔ جدید شاعری مقفیٰ ہو یا آزاد نئے زمانے کے تقاضوں کا جواب ہے۔ جدید شاعر نے جس زمانے میں آنکھ کھولی ہے۔ اس میں نہ صرف لباس بدلا ہوا ہے، بلکہ مکانوں کی ساخت، آدابِ محفل، خاندانوں کی زندگی کے طور طریقے، معاشرے کا اقتصادی ڈھانچہ سب پہلے زمانے سے مختلف ہیں۔ ایک مکانوں کی نئی ساخت ہی کو لیجئے۔ اس نے غزل اور مثنوی کا عشق ناممکن کر دیا ہے۔ پھر عورت جو بیوی ہوا کرتی تھی یا طوائف اور جس کے سہارے خاص تشبیہات اور استعارات کے ذریعے شعر کہے جاتے تھے۔ آج مرد کی رفیق کار بن کر مرد کی ایک سے زیادہ ذہنی اور جذباتی ضروریات پوری کرنے کی اہل ہو گئی ہے۔ قدیم شاعر اپنے معاشرے کا اسی طرح جزو تھا۔ جیسے کسی انجمن کے افراد اس کے جزو ہوتے ہیں۔ یا کسی زنجیر کے حلقے زنجیر کا حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن جدید شاعر محض ایک فرد رہ گیا ہے۔ قدیم شاعر کی تنہائی کو کم کرنے کے لئے اس کے مشاعروں کے سامعین موجود ہوتے تھے۔ جدید شاعر کو ان کا سہارا بھی حاصل نہیں۔ کیونکہ وہ جس زبان میں باتیں کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس کے سامعین کی زبان نہیں ہے۔ وہ جو خیالات ان کے سامنے

پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر ان کو سننے اور ان سے حظ اٹھانے پر آمادہ نہیں ہیں۔ موجودہ شاعر کی اس مجرّد تنہائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ اب خود کو زیادہ دقّتِ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے لگا ہے۔ وہ اپنا آپ جائزہ لیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی نفسیاتی غوطہ زنی کے حدود اپنی وسعت اور گہرائی دونوں میں بڑھ گئے ہیں۔ جدید شاعر اپنے قابلِ عزت پیشرو کی طرح محض افکار اور احساسات کا اظہار نہیں کرتا۔ بلکہ اسے اپنے ہر فکر اور احساس کے ساتھ طرح طرح کے سائے آویزاں نظر آتے ہیں۔ وہ ان کو بھی اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی ذہنی دنیا کی اہم مخلوق ہیں۔ موجودہ شاعر اپنے بزرگوں کے ساتھ اپنے رشتے کی شکست پر خوش ہو یا نہ ہو۔ وہ اس شکست کے اعتراف پر مجبور ہے۔ جیسے قدیم شاعر کی تربیت میں علم الاصنام، منطق، تصوّف اور فقہ کو دخل تھا۔ جدید شاعر کی تربیت میں سائنس، اقتصادیات، تحلیل نفسی، سیاست اور جمالیات کو دخل ہے۔ یہ سب نئے مضامین اس پر دزدانہ حملہ آور ہوتے ہیں شبخون مارتے ہیں۔ اور وہ انہیں اپنے افکار کا تاروپود بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اس کی زبان بھی وہ نہیں جو اس کے مقدس پیشروؤں کی زبان تھی۔ پھر اس کے اشعار اس منطقی استدلال سے محروم ہیں۔ جو غزلیہ شاعری میں ملتا ہے۔ جدید شاعر کا استدلال جذباتی استدلال ہے۔ اسی نے اسے نئے اصنافِ سخن کی تلاش پر

اکسایا ہے۔ بلکہ اصنافِ سخن کے جمود سے نچنے پر مجبور کیا ہے۔

---

جہاں تک نظموں کے اس مجموعے کا تعلق ہے۔ اسے راقم الحروف نہایت معذرت کے ساتھ شائع کر رہا ہے۔ "ماورا" کے بعد یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ لیکن اس میں "ماورا" کی نظموں کی سی تازگی اور جوانانہ شگفتگی نہیں۔ اس مجموعے کی اکثر نظمیں سمندر پار لکھی گئیں کچھ ایران میں، کچھ عراق، مصر، فلسطین، لنکا میں اور اب کچھ امریکہ میں جس نظم سے اس مجموعے نے نام پایا ہے۔ وہ ایران کے تاثرات کی حامل ہے۔ ارادہ تھا کہ یہ نظم کم از کم تیس قطعوں پر مشتمل ہو۔ لیکن یہ صرف چند قطعوں کی نا تمام نظم بن کر رہ گئی ہے۔ اس طویل نظم کے مختلف حصّے محض وارفتہ نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں داستان کا سا ربط اور ہم آہنگی مفقود ہے۔ ایران میں اپنے دو سالہ قیام کے دوران میں راقم الحروف کو نہ صرف ایرانیوں سے بلکہ بعض اور قوموں کے افراد سے بھی ملاقات کا اتفاق ہوا جنہیں گذشتہ جنگِ عظیم نے یک جا کر دیا تھا۔ یہ تاثرات ایک ہندوستانی سپاہی کے تاثرات ہیں جو ذہنی طور پر ایک برِّ عظیم کا باشندہ اور جسمانی طور پر ایک اجنبی فوج کا فرد ہے۔

ایران نے راقم الحروف کے ذہن پر ایک مستقل اثر چھوڑا ہے۔ اور اس ملک کے ساتھ ایک لازوال محبت اور شیفتگی پیدا کر دی ہے۔

لیکن " ایران میں اجنبی " جذبات کی اس کش مکش کے تجزیے کی ایک کوشش ہے جو خاص سیاسی حالات نے پیدا کر دیئے تھے یہ بکھرے ہوئے نقوش اس زمانے کی سیاست کے پردے پر بنائے گئے ہیں۔ جن میں انفرادی جذبات نے محض کشیدہ کاری کی ہے۔ اس نظم میں متعدد کردار آئے ہیں۔ لیکن سب پر صیّاد کا سایہ پڑ رہا ہے کوئی اس سائے سے خوفزدہ ہے۔ کوئی اسی کو چھاؤں سمجھ کر اس سے خنکی حاصل کر رہا ہے اور کسی کو اس کی ہلکی تاریکی نے راہزنی کا حوصلہ بخش دیا ہے۔ صیّاد کا دست آز سب پر دراز ہے۔ ہر شخص اپنی بے ہمتی سے تاریخ کی مبہم یادوں کا سہارا لیتا ہے۔ حال مستقبل کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہے۔ اور زندگی بے مقصد بن کر رہ گئی ہے۔

" ایران میں اجنبی " کے بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں۔ جن میں زیادہ زور کسی کردار کی تصویر کشی پر ہے۔ یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے۔ تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے۔ جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا انگارے کی سی ہے۔ بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں۔ ان سب قطعوں میں ایک بنیادی فکر ضرور ہے جسے آپ جیسے ذہین قاری کے لئے تلاش کر لینا چنداں مشکل نہ ہوگا اور اگرچہ ان نظموں کا تعلق جنگ کے زمانے کے ایران سے ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ خود دیکھ سکیں گے۔ یہ واقعات کہیں بھی دنیا کے کسی حصّے میں بھی پیش آ سکتے ہیں۔ جس طرح جنگ نے ایران کی معاشرتی زندگی

کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ کہیں بھی کر سکتی ہے۔

اس مجموعے کی باقی نظمیں محض نظمیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق اپنے گرد و پیش سے ضرور ہے۔ لیکن کسی میں کسی "نظریے" کی تلقین نہیں کی گئی۔ خاص طور پر کسی ایسے نظریے کی جو شاعر کی اپنی سوچ کا نتیجہ کم ہو اور کسی سیاسی گروہ کی حکمتِ عملی کا زیادہ۔ راقم الحروف کو اتفاق سے اُن غیرادبی گروہوں یا طرزِ فکر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جو ہمارے زمانے میں بعض شعرا کے لئے الہام کا تنہا سرچشمہ بن چکے ہیں۔

اِس مجموعے میں کچھ غزلیں بھی ہیں۔ میں نے غزلیں بہت کم کہی ہیں۔ غزل کی صناعی آزاد نظم کی صناعی سے مختلف ہے۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں میں نے اسے اپنے لئے کبھی موزوں ذریعہ اظہار نہیں پایا۔ اور جب بھی غزل کہی ہے بیشتر تقلیداً کہی ہے۔ اور اس میں نسبتاً روایتی اندازِ بیان غالب رہا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ چند غزلیں آپ کے ذوق کی کوئی تشفی کر سکیں گی یا نہیں۔ ٭

نیویارک

ن۔ م۔ راشد

# ایران میں اجنبی

تیرہ قطعے

# من و سلویٰ

## ۱

"خدائے برتر،
یہ داریوش بزرگ کی سرزمیں،
یہ نوشیروانِ عادل کی داد گاہیں
تصوّف و حکمت و ادب کے نگار خانے،
یہ کیوں سیہ پوست دشمنوں کے وجود سے
آج پھر اُبلتے ہوئے سے ناسور بن رہے ہیں؟"

"ہم اِس کے مجرم نہیں ہیں، جانِ عجم نہیں ہیں
وہ پہلا انگریز
جس نے ہندوستاں کے ساحل پہ
لا کے رکھی تھی جنسِ سوداگری

یہ اس کا گناہ ہے
جو ترے وطن کی
زمینِ گُل پوش کو
ہم اپنے سیاہ قدموں سے روندتے ہیں!

یہ شہر اپنا وطن نہیں ہے،
مگر فرنگی کی رہزنی نے
اسی سے ناچار ہم کو وابستہ کر دیا ہے،
ہم اس کی تہذیب کی بلندی کی چھپکلی بن کے رہ گئے ہیں!

وہ راہزن جو یہ سوچتا ہے
کہ ایشیا ہے کوئی عقیم و امیر بیوہ
جو اپنی دولت کی بے پناہی سے مبتلا اِک فشار میں ہے،
اور اس کا آغوش آرزومند و امرے انتظار میں ہے!
اور ایشیائی،
قدیم خواجہ سراؤں کی اک نژاد کاہل ہیں

اور اپنی اجل کی راہوں پہ تیز گامی سے جا رہے ہیں ——

مگر یہ ہندی
گرسنہ و پا برہنہ ہندی
جو سالکِ راہ ہیں
مگر راہ و رسمِ منزل سے بے خبر ہیں،
گھروں کو ویران کر کے،
لاکھوں صعوبتیں سہہ کے
اور اپنا لہو بہا کر
اگر کبھی سوچتے ہیں کچھ تو یہی،
—— کہ شاید انہی کے بازو
نجات دلوا سکیں گے مشرق کو
غیر کے بے پناہ بپھرے ہوئے ستم سے ——
یہ سوچتے ہیں:
—— یہ حادثہ ہی کہ جس نے پھینکا ہے
لا کے ان کو ترے وطن میں

وہ آنچ بن جائے،
جس سے پھُنک جائے
وہ جراثیم کا اکھاڑہ،
جہاں سے ہر بار جنگ کی بُوئے تند اُٹھتی ہے
اور دنیا میں پھیلتی ہے! —
مَیں جانتا ہوں
مرے بہت سے رفیق
اپنی اداس، بیکار زندگی کے
دراز و تاریک فاصلوں میں
کبھی کبھی بھیڑیوں کے مانند
آ نکلتے ہیں رہگزاروں پہ
جستجو میں کسی کے دوساقِ صندلیں کی!
کبھی دریچوں کی اوٹ میں
ناتواں پتنگوں کی پھڑپھڑاہٹ پہ
ہوش سے بے نیاز ہو کر وہ ٹوٹتے ہیں!
وہ دستِ سائل

جو سامنے ان کے پھیلتا ہے

اس آرزو میں

کہ ان کی بخشش سے

پارۂ نان من و سلویٰ کا روپ بھر لے،

وہی کبھی اپنی نازکی سے

وہ رہ سُجھاتا ہے

جس کی منزل پہ شوق کی تشنگی نہیں ہے!

تو ان مناظر کو دیکھتی ہے!

تو سوچتی ہے

—— یہ سنگدل، اپنی بزدلی سے

فرنگیوں کی محبتِ ناروا کی زنجیر میں بندھے ہیں

انہی کے دم سے یہ شہر اُبلتا ہوا سا ناسور بن رہا ہے ——!

محبت ناروا نہیں ہے،

بس ایک زنجیر،

ایک ہی آہنی کمندِ عظیم
پھیلی ہوئی ہے،
مشرق کے اِک کنارے سے دوسرے تک،
مرے وطن سے ترے وطن تک،
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں!
مغول کی صبح خوں فشاں سے
فرنگ کی شامِ جاں ستاں تک
تڑپ رہے ہیں
بس ایک ہی دردِ لادوا میں،
اور اپنے آلامِ جاں گزا کے
اس اشتراکِ گراں بہا نے بھی
ہم کو اِک دوسرے سے اب تک
قریب ہونے نہیں دیا ہے!"

---

# میزبان

## ۲

ملاقاتِ اوّل میں نوروز بولا
"میں اک کارگر رنج بر ہوں
سوادِ کتابی کی لذّات سے بے خبر ہوں
مرا سن ہے بچپن سے اوپر
مگر میرے بالوں میں اِک تارِ خاکستری تک
ہویدا نہیں ہے۔
وہ خوش بخت ہوں
جس کی دو بیویاں ہیں،

جواں سال و رعنا

اور ان میں خیابانِ شاؔپور کی رہنے والی

مری ہژدہ سالہ زلیخا

جمیل و جواں تر ہے

اسفؔند کی شمعِ رخشندہ گوہر ملک سے

مگر، تم یہ باور کرو گے

کہ ان دو حریفوں کو اِک دوسرے کی

خبر تک نہیں ہے؟"

وہ کہنے لگا:

"تم اگر آج کی شب

زلیخؔا کے گھر میں

پنیر اور روٹی مرے ساتھ کھاؤ،

تو ہم دونوں ممنون و دل شاد ہوں گے!"

یہی وہ محبّت کی پہلی کرن تھی

کہ جس نے ہمارے دلوں سے بُھلا دی تھی یادِ وطن بھی!

تو نوروز بولا:

"مگر ہاں یہ سُن لو،

کہ تم نے تمہارے کسی آشنا نے

جو، قربان، میری زلیخا کو ناسد نگاہوں سے دیکھا،

تو یہ نیمچہ اس کے ناپاک سینے میں بیشک اتر کر رہے گا۔"

تو جب صبحِ فردا

ابھی ہم خمارِ شب رفتہ سے سرگراں تھے

ابھی تک دماغوں پہ چھایا ہوا تھا دھواں سا

ابھی تک نگاہوں میں

حسن و مئے و رقص و نغمہ کے بکھرے ہوئے تار

قالین سے بُن رہے تھے،

اور اک خواب گوں تیرگی میں،

کبھی ایک دو، اور کبھی سینکڑوں آتشیں جام

ہنستے تھے، گاتے تھے، اور دور میں گھوم کر ناچتے تھے

وہ ہر بار جب سامنے سے گذرتے تھے

اُن میں سے تیرہ وسناں سر نکالے ہوئے جھانکتے تھے
کہ جیسے ہماری ہی جانب بڑھیں گے
ہمارے ہی دہشت سے بے انتہا سرد جسموں کو
بس چیر جائیں گے اِک عالمِ بے بسی میں!

کبھی اپنی دیرینہ محرومیاں،
اور کبھی قید و بندِ عمل سے وہ تازہ رہائی
سُجھاتی تھی سرگوشیوں میں:
"یہ دیوانہ گر رات ہو
اور پھر بھی نہ ہو دشنۂ جانستاں تک گوارا؟"

تصوّر دکھاتا تھا لیکن،
مرے ساتھیوں میں سے اِک مردِ میداں
کہ جس نے کسی ساعدِ نور کو چھُو لیا ہے
دھڑم سے گرا ہے
اور اس کا لباس کبودی

ہے سب خوں میں لتھڑا ہوا پارہ پارہ!

تو نوروز آیا، ہنسا اور کہنے لگا:
"تم بڑے سنگدل ہو
تمہارا وہ ساتھی تو کل شب وہیں سو گیا تھا
بہت اس کی دل جوئی کرتی رہی میری گل رو غزالہ،
کہ وہ اپنی مہجور بیوی کی تصویر کو
سامنے رکھ کے آنسو بہاتا رہا ہے!
تمہیں کیا مصیبت پڑی تھی
جو تم نیم شب لوٹ آئے تھے
منزل کی آسودگی چھوڑ کر
ہُو کے عالم میں،
جب کوئے ویرزن میں
آوازۂ سگ تھی نہ آوائے درباں؟"

وہ مہجور بیوی کی تصویر ——

وہ ایک گلرُو غزالہ کی دلجوئیاں —
وہ میرے نیم شب، لوٹ آنے کا ارماں —
تو، اس پہ رہی سب کے دل میں یہ اُلجھن
کہ ساقی کے "شہکار" کا راز جانیں!

# نارسائی

## ۳

درختوں کی شاخوں کو اتنی خبر ہے
کہ ان کی جڑیں کھوکھلی ہو چلی ہیں
مگر ان میں ہر شاخ بزدل ہے
یا مبتلا خود فریبی میں شاید
کہ ان کرم خوردہ جڑوں سے
وہ اپنے لئے تازہ نم ڈھونڈتی ہے!

میں مہمانخانے کے سالون میں
ایک صوفے میں چپ چاپ دبکا ہؤا تھا،
گرانی کے باعث وہاں دُختران عجم تو نہ تھیں

ہاں کوئی بیس گز پر
فقط ایک چہرہ تھا جس کے
خدوخال کی چاشنی ارمنی تھی!

زمستاں کے دن تھے،
لگاتار ہوتی رہی تھی سرِ شام سے برفباری
دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے،
مگر برف کا رقصِ سیمیں تھا جاری
وہ اپنے لباسِ حریری میں
پاؤں میں گلہائے نسریں کے زنگولے باندھے،
بدستور اک بے صدا سہل انگار سی تال پر ناچتی جا رہی تھی!

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بیکراں خامشی چھا گئی تھی
خیاباں کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
یخ کے گلولے، پرندے سے بن کر لٹکنے لگے تھے
زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے

کف آلود ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی!

میں اِک گرم خانے کے پہلو میں صوفے پہ تنہا پڑا سوچتا تھا
بخاری میں افسردہ ہوتے ہوئے رقص کو گھورتا تھا۔

"اجازت ہے میں بھی
ذرا سینک لوں ہاتھ اپنے؟"
[زباں فارسی تھی تکلم کی شیرینیاں اصفہانی!]
"تمہیں شوق شطرنج سے ہے؟"
[اٹھا لایا میں اپنے کمرے سے شطرنج جا کر!]
"بچو فیل ——
اسپِ سیہ کا تو خانہ نہیں یہ ——
بچاؤ وزیر ——
اور لو یہ پیادے کی شہ لو ——
اور اک اور شہ!
اور یہ آخری مات!
بس ناز تھا کیا اسی شاطری پر؟"

میں اچھا کھلاڑی نہیں ہوں
مگر آن بھر کی خجالت سے میں ہنس دیا تھا!
"ابھی اور کھیلو گے؟

لو اور بازی ——

یہ اک اور بازی . . . ."
یونہی کھیلتے کھیلتے صبح ہونے لگی تھی!
مؤذن کی آواز اس شہر میں زیرِ لب ہو چکی ہے
سحر پھر بھی ہونے لگی تھی!
وہ دروازے جو سالہا سال سے بند تھے
آج وا ہو گئے تھے!
میں کرتا رہا ہند و ایراں کی باتیں
". . . اور اب عہدِ حاضر کے ضحّاک سے
رستگاری کا رستہ یہی ہے
کہ ہم ایک ہو جائیں، ہم ایشیائی
وہ زنجیر، جس کے سرے سے بندھے تھے کبھی ہم
وہ اب سست پڑنے لگی ہے

تو آؤ کہ ہے وقت کا یہ تقاضا
کہ ہم ایک ہو جائیں —— ہم ایشیائی!"
میں رُوسی حکایات کے ہرزہ گو نوجوانوں کے مانند یہ بے محل وعظ
کرتا رہا تھا!

اسے صبحدم اس کی منزل پہ جب چھوڑ کر آ رہا تھا،
وہ کہنے لگی:
"اب سفینے پہ کوئی بھروسہ کرے کیا
سفینہ ہی جب ہو پرِ وبالِ طوفاں
یہاں بھی وہاں بھی وہی آسماں ہے،
مگر اس زمیں سے خدایا رہائی!
خدایا دہائی!!
ٹھکانہ ہے لوٹی گری رہزنی کا!
یہاں زندگی کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں،
فقط شاخسار یں
ابھی اپنی افتاد کے حشر سے ہیں گریزاں!
یہ بچپن میں میں نے پڑھی تھی کہانی

کہا ساحرہ نے:
"کہ اے شاہزادے
رہِ جستجو میں
اگر اس لق و دق بیاباں میں
دیکھا پلٹ کر،
تو پتّھر کا بُت بن کے رہ جائے گا تو!"
جہاں سب نگاہیں ہوں ماضی کی جانب
وہاں راہرو ہیں فقط عازمِ نارسائی!"

تو دن بھر یہی سوچ تھی
کیا ہمارے نصیبے میں افتاد ہے،
کوئی رفعت نہیں؟
کوئی منزل نہیں ہے؟

# کیمیاگر

۴

رضا شاہ!
تجھ پر سلام اجنبی کا!
سلام ایک ہندی سپاہی کا تجھ پر!
مجھے تو کہاں دیکھ سکتا ہے؟
تیری نگاہیں تو البرز کے پار اُفق پر لگی ہیں!
یہاں — میں ترے بُت کے نیچے
چمکتی ہوئی سیڑھیوں پر کھڑا ہوں!
سُنا ہے کہ اُس انتہائی عقیدت کی خاطر
جو بخشی گئی تھی تجھے اپنی ذاتِ گرامی سے،
تُو نے یہ بُت

اپنی فرماں روائی میں
یورپ کے مشہور ہیکل تراشوں سے بنوا کے
اس چوک میں نصب کروا دیا تھا!
اسی سے ہویدا ہے یہ بھی
کہ ملت کی احساں شناسی پہ کتنا بھروسہ تھا تجھ کو!

رضا شاہ!
اے داریوش اور سیروس کے جانشیں
یہ قلمرو،
تجھے جس کی تزئین کی لو لگی تھی
جسے تو خدا کی اماں میں بھی دینا گوارا نہ کرتا،
یہی، شہرِ لوَر کے الم زا حوادث کے بعد
آج قدموں میں تیرے پڑی ہے،
یہ بے جان لاشہ
جسے تین خونخوار کرگس
نئی اور بڑھتی ہوئی آز سے نوچتے جا رہے ہیں!

وطن اور ولی عہد کی والہانہ محبّت ،
ترے ہوش و فکر و عمل کے لئے
کونسی چیز مہمیز کا کام دیتی تھی
سب جانتے ہیں !
مگر تو وہ معمار تھا جس کو
بنیاد سے کوئی مطلب نہ تھا
وہ تو رخنوں کو آنکھوں سے روپوش کرنے میں ،
چھت اور دیوار و در کی زینت پہ گلگونہ ملنے میں
دن رات بے انتہا تندہی سے لگا تھا !

یہ مشہور ہے
تُو نے اِک روز نادر کی تربت پہ جا کر
کہا تھا :
" کہ نادر میں سب خوبیاں تھیں
مگر پیٹ کا اتنا ہلکا
کہ لوگ اس کے مقصود کو بھانپ لیتے ! "

یہ سچ ہے کہ نادر اگر نیم شب
صبح کے وحشت افزا ارادے کو افشا نہ کرتا
تو یُوں قتل ہونے کی نوبت نہ آتی!
مگر وہ تری حد سے گذری ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھے
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا،
—— وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو
جہاں ہر عقیدے کو تو
اپنے الہام کے شیشۂ کور میں دیکھتا تھا،
جہاں ایک چھوٹا سا روزن بھی ایسا نہ تھا،
جس میں ملّت کے افکار کی اک کرن کا گذر ہو!
اسی کا نتیجہ۔ کہ اک روز
کہنے کو باتیں بہت تھیں
مگر سننے والے کہیں بھی نہ تھے

اور تجھے بھی تو کر ہو گئے تھے!

تجھے اس زمیں سے گئے دو برس ہو چکے ہیں
تری یاد تک مٹ چکی ہے دلوں سے
کبھی یاد کرتا ہے کوئی تو کہتا ہے،
"وہ کیمیاگر
جو کرتا رہا سب سے وعدے
کہ لاؤں گا سونا بنا کر
مگر شہریوں کے مس و سیم تک
لے کے چلتا بنا ہے؟"

یہ طہران جو تیرے خوابوں میں
پارِیس کا نقشِ ثانی تھا،
یوں تو یہاں رہگذاروں میں
بہتا ہے ہر شام سیما فروشوں کا سیلاب جاری،
یہاں رقص گاہوں میں اب بھی

بہت جھلملاتی ہیں محفل کی شمعیں
یہاں رقص سے چور
یا جام و بادہ سے مخمور ہو کر
وطن کے پجاری
بآہنگِ سنتور و تار و دف و نے
لگاتے ہیں مل کر
"وطن! اے وطن!" کی صدائیں!
مگر کون جانے یہ کس کا وطن ہے؟

کہ پارلیس بھی آج اس کا ہیولا ہے بیچارگی میں
کہ اُس پر فقط برقِ خرمن گری تھی
اسے شعلہ ہائے نیستاں نگلتے چلے جا رہے ہیں!

---

# ہمہ اوست

## ۵

خیابان سعدی میں
روسی کتابوں کی دکان پر ہم کھڑے تھے
مجھے روس کے چیدہ صنعت گروں کے
نئے کارناموں کی اک عمر سے تشنگی تھی!
مجھے روسیوں کے "سیاسی ہمہ اوست" سے کوئی رغبت نہیں ہے
مگر ذرّے ذرّے میں
انساں کے جوہر کی تابندگی دیکھنے کی تمنّا ہمیشہ رہی ہے!
اور اس شام تو مرسدہ کی عروسی تھی،
اُس شوخ دیوانی لڑکی کی خاطر
مجھے ایک نازک سی سوغات کی جستجو تھی

وہ میرا نیا دوست خالد

ذرا دُور، تختے کے پیچھے کھڑی

اِک تنومند لیکن فسوں کار،

قفقاز کی رہنے والی حسینہ سے شیروشکر تھا!

یہ بھوکا مسافر

جو دستے کے ساتھ

ایک خیمے میں، اِک دُور افتادہ صحرا میں

مُدت سے عُزلت گزیں تھا،

بڑی التجاؤں سے

اس حورِ قفقاز سے کہہ رہا تھا،

"نجانے کہاں سے ملا ہے

تمہاری زباں کو یہ شہد

اور لہجے کو مستی!

میں کیسے بتاؤں

میں کس درجہ دلدادہ ہوں روسیوں کا

مجھے اشتراکی تمدّن سے کتنی محبّت ہے،

کیسے بتاؤں!
یہ ممکن ہے تم مجھ کو روسی سکھا دو؟
کہ روسی ادیبوں کی سرچشمہ گاہوں کو میں دیکھنا چاہتا ہوں!"

———

وہ پروردۂ عشوہ بازی
کنکھیوں سے یوں دیکھتی تھی
کہ جیسے وہ اُن سرنگوں آرزوؤں کو پہچانتی ہو،
جو کرتی ہیں اکثر یونہی روشناسی
کبھی دوستی کی تمنّا،
کبھی علم کی پیاس بن کر!
وہ کوٹھے ہلاتی تھی، ہنستی تھی
اک سوچی سمجھی حسابی لگاوٹ سے،
جیسے وہ ان خفیہ سرچشمہ گاہوں کے ہر راز کو جانتی ہو
وہ تختے کے نیچے کھڑی قہقہے مارتی لوٹتی تھی!

کہا میں نے خالد سے،

"بہروپئے!

اس ولایت میں ضرب مثل ہے

"کہ اونٹوں کی سوداگری کی لگن ہو

تو گھر اُن کے قابل بناؤ ——

اور اس شہر میں یوں تو استانیاں ان گنت ہیں

مگر اس کی اُجرت بھلا تم کہاں دے سکو گے!"

وہ پھر مضطرب ہو کے، بے اختیاری سے ہنسنے لگی تھی۔

وہ بولی:

"یہ سچ ہے،

کہ اُجرت تو اک شاہی بھر کم نہ ہوگی

مگر فوجیوں کا بھروسہ ہی کیا ہے،

بھلا تم کہاں باز آؤ گے

آخر زباں سیکھنے کے بہانے

خیانت کرو گے!"

وہ ہنستی ہوئی

اک نئے مشتری کی طرف ملتفت ہو گئی تھی!

تو خالد نے دیکھا
کہ رومان تو خاک میں مل چکا ہے!
اُسے کھینچ کر جب میں بازار میں لا رہا تھا،
لگاتار کرنے لگا وہ قولوں میں باتیں
"زباں سیکھنی ہو تو عورت سے سیکھو
جہاں بھر میں روسی ادب کا نہیں کوئی ثانی
وہ قفقاز کی حور، مزدور عورت!
جو دُنیا کے مزدور سب ایک ہو جائیں
آغاز ہو اِک نیا دورۂ شادمانی!"

مرے دوستوں میں بہت اشتراکی ہیں،
جو ہر محبّت میں مایوس ہو کر
یونہی اِک نئے دورۂ شادمانی کی حسرت میں
کرتے ہیں دلجوئی اِک دوسرے کی
اور اب ایسی باتوں پہ میں
زیرِ لب بھی کبھی مسکراتا نہیں ہوں!

اور اس شام جشنِ عروسی میں
حسن و مئے و رقص و نغمہ کے طوفان بہتے رہے تھے
فرنگی شرابیں تو عنقا تھیں
لیکن مئے ناب قزوین و خلّارِ شیراز کے دورِ پیہم سے،
رنگیں لباسوں سے
خوشبو کی بے باک لہروں سے
بے ساختہ قہقہوں ہمہموں سے
مزامیر کے زیر و بم سے
وہ ہنگامہ برپا تھا،
محسوس ہوتا تھا
طہران کی آخری شب یہی ہے!
اچانک کہا مرسدہ نے:
"تمہارا وہ ساتھی کہاں ہے؟
ابھی ایک صوفے پہ دیکھا تھا میں نے
اسے سر بزانو!"
تو ہم کچھ پریشان سے ہو گئے

اور کمرہ بہ کمرہ اسے ڈھونڈنے ہل کے نکلے!

لو اک گوشۂ نیم روشن میں

وہ اشتراکی زمیں پر پڑا تھا

اسے بم ہلا یا گئے اور جھنجھوڑا گئے

وہ تو ساکت تھا جامد تھا

روسی ادیبوں کی سرچشمہ گاہوں کی اس کو خبر ہوگئی تھی!

# ماہِ سیاہ

۶

سرِ شام ہم یاسمن سے ملے تھے
وہ بُت کی طرح بے زباں اور افسردہ،
اِک کہنہ و خستہ گھر میں،
ہمیں لے کے داخل ہوئی تھی!
کسی پیرہ زن نے ہمارا وہاں
شمعِ لرزاں لئے خیر مقدم کیا تھا،
مئے کم بہا اور خیّام سے
میری اور دوستوں کی مدارات کی تھی!
مگر یاسمن کی نگاہیں جھکی تھیں
وہ بالیں پہ زلفِ سیہ میں

سپیدے کے داغوں کو مجھ سے چھپاتی رہی تھی!
وہ پھر ہم سے مہمانخانے میں ملتی رہی تھی،
شکر اور قہوے کے ملفوفِ ارزاں
جو بازار میں انتہائی گراں تھے
وہ ہر بار ہم سے بصد معذرت لے کے جاتی رہی تھی!
خیاباں میں وہ مسکرا کر گذرتی
تماشا گھروں اور تفریح گاہوں کی خلوت کو جلوت بناتی رہی تھی
ہم اس لطفِ آسان ربودہ پہ نازاں رہے تھے!

مگر کل سحر وہ دریچے کے نیچے
جہاں سیب کے اک شجر کے گلابی شگوفے
ابھی کھِل رہے ہیں
رُکی اور کہنے لگی
"آج کے بعد تم یاسمن کو نہیں پا سکو گے
کہ مارِ سیہ رنگ اِک اجنبی نے اُسے ڈس لیا ہے!"

میں خود اجنبی ہوں
مگر سُن کے یوں دم بخود ہو گیا تھا
کہ جیسے مجھی کو وہ مارِ سیہ ڈس گیا ہو!
میں اُٹھا ، خیاباں میں نکلا
اور اک کہنہ مسجد کی دیوار سے لگ کے
آنسو بہاتا رہا ہوں

---

# دستِ ستمگر

۷

یہاں اس سرائے سرِ پل میں یوں تو،
رہی ہر ملاقات تنہائیِ سخت تر کا ہیولا،
مگر آج کی یہ جُدائی
سپاہی کے دل کی کچھ ایسی جراحت ہے
جو اُس کو بستر میں آسودہ رکھے گی لیکن
کبھی اُس کے ہونٹوں پہ
ہلکی سی موجِ تبسّم بھی اُٹھنے نہ دے گی!

خدا حافظ، اے گلعذارِ لبستان،
مبارک کہ تو آج دُنیائے نو کو چلی ہے!

جہاں تیرا ہمسر تجھے آج لے جا رہا ہے
نیستاں تو بے شک وہاں بھی نہ ہوگا
مگر اس ولائیت میں
جو حرّیت کیش جمہور کی آنکھ کا ہے درخشندہ تارا،
تجھے بے حقیقت سہاروں سے
غیروں کی خاطر شب و روز کی اِس مشقّت سے
کچھ تو ملے گی رہائی!
وہاں تجھ کو آہنگِ رنگ و زباں
کچھ تو تسکین دے گا،
اور اس غم سے پامال ہجرت گزینوں کے
سہمے ہوئے قافلے سے
الگ ہو کے منزل کا دھوکا تو ہوگا!
یہ مانا کہ تو شاخسارِ شکستہ ہے
اور شاخسار شکستہ رہے گی!
مگر اُس نئی سرزمیں میں
تجھے سبز پتّوں کی، شاداب پھولوں کی، امید پیدا تو ہوگی!

تجھے کیسے روندا گیا ہے،
تجھے دربدر کیسے راندا گیا ہے،
میں سب جانتا ہوں،
کہ شاکی ہے تو جس الم کی
وہ تنہا کسی کا نہیں۔ ہے
وہ بڑھتا ہوا
آج ذرّے سے عفریت بنتا چلا جا رہا ہے!

تو نازی نہ تھی،
تجھ کو فاشی تخیّل سے کوئی لگاؤ نہ تھا
بس ترا جُرم یہ تھا،
تجھے عافیت کی طلب تھی
وطن کی محبت بھری سر زمیں کی
شبِ ماہ، بزمِ طرب، جام و مینا کی
منزل کی آسودگی کی طلب تھی،
طلب تھی سحر گاہ، محبوب کے گرم، راحت سے لبریز
بالش پہ خوابِ گراں کی!

اور اس جُرم کی یہ سزا ، [ اے خدا ]
سامنے تیری بے بس نگاہوں کے محبوب کی لاش ،
پھر اجنبی قید میں
روس کے برف زاروں میں بیگار
روٹی کے شب ماندہ ٹکڑوں کی خاطر ؟
اور اب سال بھر سے
یہ فوجی سراؤں میں خدمت گذاری
یہ دریوزہ کوشی ،
یہ دو نیم بے مُدّعا زندگی
جس کا ماضی تو ویراں تھا ،
آئندہ و حال بھی بے نشاں ہو چکے ہیں !
حقیقت کی دُنیا تو ہے ہی
مگر اِک خیالوں کی خوابوں کی دُنیا بھی ہوتی ہے
جو آخر کار بنتی ہے تقدیر کا خطِ جادہ !
مگر یہ ستم کی نہایت ،
کہ تیرے خیالوں پہ خوابوں پہ بھی

تو یہ تو یاس کائی کے مانند جمنے لگی تھی!

کہاں بھول سکتا ہوں، اے عندلیب لہستاں
وہ نغمے لہستاں، کے دہقانی نغمے
جو فوجی سرائے کی بے کار شاموں میں
تیری زباں سے سنے ہیں،
وہ جن میں سیہ چشم ہندی کی خاطر
لہستاں کی عورت کا دل یوں دھڑکتا ہے
جیسے وہ ہندی کی مُشکینہ رعنائیوں تک پہنچ کر رہے گا!
جنہیں سُن کے محسوس ہوتا رہا ہے
کہ مغرب کی وہ روحِ شب گرد
جو پے بہ پے وسوسوں میں گھری ہے
تعاقب کیا جا رہا ہے دبے پاؤں جس کا
اب آخر شبستانِ مشرق کے اُجڑے ہوئے آشیانوں کے اوپر
لگاتار منڈلا رہی ہے!

اُسی رُوحِ شب گرد کا

اِک کنایہ ہے شاید
یہ ہجرت گزینوں کا بکھرا ہوا قافلہ بھی
جو دستِ ستمگر سے مغرب کی مشرق کی پہنائیوں میں
بھٹکتا ہوا پھر رہا ہے!

خدا حافظ اے ماہتابِ لہستاں
یہی اک سہارا ہے باقی ہمارے لئے بھی
کہ اِس اجنبی سرزمیں میں
ہے یہ ساز و ساماں بھی گویا
ہوا کی گذرگاہ میں اک پرِ کاہ!
بکھر جائے گا جلد
افسردہ حالوں کا، خانہ بدوشوں کا یہ قافلہ بھی
اور اک بار پھر عافیت کی سحر
اس کا نقشِ کفِ پا بنے گی!

---

# درویش

۸

زمستاں کی اس شام
نیچے خیاباں میں
میرے دریچے کے پائیں
جہاں تیرگی منجمد ہو گئی ہے
یہ بھاری یخ آلود قدموں کی آواز
کیا کہہ رہی ہے:

"خداوند!
کیا آج کی رات بھی
تیری پلکوں کی سنگیں چٹانیں
نہیں ہٹ سکیں گی؟"

خیاباں تو ہے دُور تک گہری ظلمت کا پاتال
اور میں اس میں غوطہ زنی کر رہا ہوں
صداؤں کے معنی کی سینہ کشائی کی خاطر چلا ہوں!

یہ درویش،
جس کے اب وجد،
وہ صحرائے دیروز کی ریت پر
تھک کے مر جانے والے
اسی کی طرح تھے
تہی دست اور خاک تیرہ میں غلطاں،
جو تسلیم کو بے نیازی بنا کر
ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لئے
بال و پر جانتے تھے،
جنہیں تھی فروغِ گدائی کی خاطر
جلالِ شہی کی بقا بھی گوارا
جو لاشوں میں چلتے تھے

کہتے تھے لاشوں سے :

"سوتے رہو !

صبحِ فردا کہیں بھی نہیں ہے !"

وہ جن کے لئے حریّت کی نہایت یہی تھی

کہ شاہوں کا اظہارِ شاہنشہی

حد سے بڑھنے نہ پائے !

بھلا حد کی کِس کو خبر ہے ؟

مگر آج کا یہ گدا ،

یہ ہمیشہ کا محروم بھی

اُن اب وجد کے مانند

گو وقت کے شاطروں کی سیاست کا مارا ہوا ہے

ستم یہ کہ اس کے لئے آج ،

ملّائے رومی کے ،

مجذوبِ شیراز کے

زنگ آلودہ ادہام بھی

دستگیری کو حاضر نہیں ہیں!

"خداوند!
کیا آج کی رات بھی
تیری پلکوں کی سنگیں چٹانیں
نہیں ہٹ سکیں گی؟"
تجھے اسے زمانے کے روندے ہوئے،
آج یہ بات کہنے کی حاجت ہی کیوں ہو؟
تو خوش ہو
کہ تیرے لئے کھل گئی ہیں ہزاروں زبانیں
جو تیری زباں بن کے
شاہوں کے خوابیدہ محلوں کے چاروں طرف
شعلے بن کر لپٹتی چلی جا رہی ہیں!
سیاست نے سوچا ہے،
تیری زباں بند کر دے
سیاست کو یہ کیوں خبر ہو

کہ لب بند ہوں گے
تو کھل جائیں گے دست و بازو ؟

وہ بھاری یخ آلود قدموں کی آواز
یک لخت خاموش کیوں ہو گئی ہے ؟
نوآموز مشرق کے
نوخیز آئین کے تازیانو،
سکوتِ گدا سے
گدائی تو ساکت نہ ہو گی !

---

# خلوت میں جلوت

۹

حسن اپنا ساتھی
جو اُس رات، نوروز کے ہاں
جمالِ عجم کے طلسمات میں بہہ گیا تھا
پھر اِک بار مستی میں جلوت کو خلوت سمجھ کر
بڑی دیر تک روبرو آئینے کے
کھڑا جھومتا منہ چڑاتا رہا تھا،
وہ بلّور کی بے کراں جھیل کے دیو کو گالیاں دے کے ہنستا رہا تھا،
حسن اپنی آنکھوں میں رقّت کا سیلاب لاکر
زمستاں کی اُس شام کی تازہ مہماں سے
اُس شہرِ آشوبِ طہران سے

کہتا چلا جا رہا تھا!
تو میری بہن ہے،
تو میری بہن ہے،
"اُٹھ اے میری پیاری بہن میری زہرا!
ابھی رات کے در پہ دستک پڑے گی،
تجھے اپنے کاشانۂ ناز میں چھوڑ آؤں!"
اور اِس پر برافروختہ تھے،
پریشاں تھے سب ہم!

جُونہی اُس کو جعفر نے دیکھا نگاہیں بدل کر
وہ چلّا کے بولا:
"درندو
اسے چھوڑ دو،
اس کے ہاتھوں میں
انگشتری کا نشاں تک نہیں ہے"!

حسن مرد میداں تو تھا ہی
مگر نارسائی کا احساس
مستی کے شاداب لمحوں میں اُس سے
کراتا تھا اکثر
یہ عہد سلاطیں کے گذرے ہوئے
شہسواروں کے عالم کی باتیں!
مگر جب سحر گاہ اردو میں قرنا ہوئی
اور البرز کی چوٹیوں سے نکل آیا سورج
تو آنکھیں کھلی رہ گئیں ساتھیوں کی
حسن کے رُخ و دست و بازو
خراشوں سے یوں نیلگوں ہو رہے تھے
کہ جیسے وہ جنّوں کے نرغے میں شب بھر رہا ہو
ہمیں سب کو جعفر پہ شک تھا
کہ شاید اسی نے نکالا ہو یہ اپنے بدلے کا پہلو!
مگر جب حسن اور جعفر نے
دونوں نے

کھائیں کئی بار قسمیں
تو ناچار لب دوختہ ہو گئے ہم
وہاں اب وہ جانِ عجم بھی نہ تھی
جس سے ہم پوچھ سکتے
ذرا اور کاوش سے پوچھا حسَن سے
تو بے ساختہ ہنس کے کہنے لگا "بس مجھے کیا خبر ہو۔
اگر پوچھنا ہو تو زہرا سے پوچھو
مری رات بھر کی بہن سے!"

---

# تیل کے سوداگر

۱۰

بخارا سمر قند اک خالِ ہندو کے بدلے!
بجا ہے، بخارا سمر قند باقی کہاں ہیں؟
بخارا سمر قند نیندوں میں مدہوش،
اک نیلگوں خامشی کے حجابوں میں مستور
اور رہرووں کے لئے ان کے در بند،
سوئی ہوئی مہ جبینوں کی پلکوں کے مانند،
روسی "ہمہ اوست" کے تازیانوں سے معذور
دو مہ جبینیں!

بخارا سمر قند کو بھول جاؤ

اب اپنے درخشندہ شہروں کی
طہران و مشہد کے سقف و در و بام کی فکر کر لو،
تم اپنے نئے دَورِ ہوش و عمل کے دلآویز جسموں کو
اپنی نئی آرزوؤں کے ان خوبصورت کنایوں کو
محفوظ کر لو!

ان اونچے درخشندہ شہروں کی
کوتہ فصیلوں کو مضبوط کر لو
ہر اک برج و بارو پہ اپنے نگہباں چڑھا دو،
گھروں میں ہوا کے سوا،
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن،
تیل کے بوڑھے سوداگروں کے لبادے پہن کر،
وہ کل رات یا آج کی رات کی تیرگی میں،
چلے آئیں گے بن کے مہماں
تمہارے گھروں میں،

وہ دعوت کی شب جام و مینا لنڈھائیں گے
ناچیں گے، گائیں گے،
بے ساختہ قہقہوں ہمہموں سے
وہ گرمائیں گے خونِ محفل!

مگر پَو پھٹے گی
تو پلکوں سے کھودو گے خود اپنے مُردوں کی قبریں
بساطِ ضیافت کی خاکسترِ سوختہ کے کنارے
بہاؤ گے آنسو!

بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو!
——گو اب خالِ ہندو کی ارزش نہیں ہے
عذارِ جہاں پر وہ رِستا ہوا گہرا ناسور
افرنگ کی آزِ خونخوار سے بن چکا ہے——
بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو،
ہماری نگاہوں نے دیکھے ہیں

سیال سایوں کے مانند گھلتے ہوئے شہر،
گرتے ہوئے بام ودر،
اور مینار و گنبد،
مگر وقت محراب ہے
اور دشمن اب اس کی خمیدہ کمر سے گذرتا ہوا
اس کے نچلے افق پر لڑھکتا چلا جا رہا ہے!
ہمارے برہنہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور وہ تازیانے سہے ہیں
کہ ان سے ہمارا ستمگر
خود اپنے الاؤ میں جلنے لگا ہے!

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ و الوند کی چوٹیوں پر انا کی شعاعیں،
انہیں سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر

بخارا سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں!

# وزیرے چنیں

۱۱

.... تو جب سات سو آٹھویں رات آئی
تو کہنے لگی شہرزاد:
"اے جواں بخت
شیراز میں ایک رہتا تھا نائی،
وہ نائی تو تھا ہی۔
مگر اُس کو بخشا تھا قدرت نے،
اِک اور نادر، گراں تر ہنر بھی،
کہ جب بھی،
کسی مردِ دانا کا ذہنِ رسا،
زنگ آلودہ ہونے کو آتا

تو نائی کو جا کر دکھاتا
کہ نائی دماغوں کا مشہور ماہر تھا،
وہ کاسۂ سر سے اُن کو الگ کر کے،
اُن کی سب آلائشیں پاک کر کے،
پھر اپنی جگہ پر لگانے کے فن میں تھا کامل!
خدا کا یہ کرنا ہوا،
ایک دِن
اُس کی دکّان سے
ایران کا اِک وزیرِ کہن سال گذرا
اور اُس نے بھی چاہا
کہ وہ بھی ذرا
اپنے اُلجھے ہوئے ذہن کی
از سرِ نو صفائی کرائے!

کیا کاسۂ سر کو نائی نے خالی
ابھی وہ اُسے صاف کرنے لگا تھا،

کہ ناگاہ آکر کہا ایک خواجہ سرا نے
میں بھیجا گیا ہوں جناب وزارت پنہ کو بلانے
اور اُس پر
سراسیمہ ہو کر جو اُٹھا وزیر ایک دم،
رہ گیا پاس ولاک کے مغز اُس کا
وہ بے مغز سر لے کے دربارِ سلطاں میں پہنچا
— مگر دوسرے روز اُس نے
جو نائی سے آکر تقاضا کیا
تو وہ کہنے لگا:

"حیف،

کل شب پڑوسی کی بلّی
کسی روزنِ در سے گھس کر
جنابِ وزارت پنہ کے
دماغِ فلک تاز کو کھا گئی ہے!
اور اب حکم سرکار ہو تو،
کسی اور حیوان کا مغز لے کر لگا دوں؟

تو دلآک نے رکھ دیا،
دانیالِ زمانہ کے سر میں،
کسی بیل کا مغز لے کر!
تو لوگوں نے دیکھا
جنابِ وزارت پناہ اب،
فراست میں
دانش میں
اور کاروبارِ وزارت میں،
پہلے سے بھی چاق و چوبند تر ہو گئے ہیں!"

---

# شاخِ آہو

۱۲

وزیرِ معارف علی کیانی نے
"شمشیرِ ایراں" کا تازہ مقالہ پڑھا،
اور محسن فرخزاد کی تازہ "تصنیف" دیکھی،
جو طہران کے سب تماشا گھروں میں
کئی روز سے قہقہوں کے سمندر بہانے لگی تھی
تو وہ سر کھجانے لگا،
اور کہنے لگا:
"لوا سے کہہ رہے ہیں،
علی کیانی کی تازہ جنایت!

بھلا کونسا ظلم ڈھایا ہے میں نے
جو بانو رضا بہبانی سے
اسّی ہزار اور نو سو ریال
اپنا حق جان کر
راہداری کے بدلے لئے ہیں ؟
خدائے توانا و برتر
وزارت ہے وہ دردِ سر
جس کا کوئی مداوا نہیں ہے !
رضا بہبانی ولائیت سے
ڈگری طبابت کی لے کر،
جو لوٹے گی
کچھ تو کمائے گی،
پہلے سے بڑھ کر کمائے گی آخر
اور اس پر یہ ایماں فروشی کے طعنے
یہ کہرام، اے مسخرے روزنامہ نگارو !
یہاں سات بچّوں کے تنور

ہر لحظہ فریاد کرتے ہوئے
اور خانم کے
گلگونہ و غازہ و کفش و موزہ کے
یہ روز افزوں تقاضے،
اُدھر یہ گرانی،
اِدھر یہ وزارت کی کُرسی
فقط شاخِ آہو!"

تو اس پر علی کیانی نے سوچا
اٹھایا قلم اور لکھا:
"جنابِ مدیرِ شہیر
آپ کی خدمتِ فائقہ کے عوض
دس ہزار اور چھ سو ریال
آپ کو صد ہزار احترامات کے ساتھ
تقدیم کرتا ہے بندہ!"
یہ پرکالۂ آتشیں چھوڑ کر

اور "مقالہ و تصنیف" کی یاد دل سے بھلا کر
لگا جھولنے اپنی کرسی میں آسودہ ہو کر
وزیرِ معارف علی کیانی!

---

# تماشاگہہ لالہ زار

## ۱۳

تماشاگہہ لالہ زار،

"تیاتر" پہ میری نگاہیں جمی تھیں
مرے کان "موزیک" کے زیر و بم پر لگے تھے،
مگر میرا دل پھر بھی کرتا رہا تھا
عرب، اور عجم کے غموں کا شمار
تماشاگہہ لالہ زار!

تماشاگہہ لالہ زار،

"اب ایراں کہاں ہے؟

یہ عشق کا شہکار — "ایران کی رستخیز" !
اب ایراں ہے اِک نوحہ گر پیرزال
ہے مدّت سے افسردہ جس کا جمال ،
مدائن کی ویرانیوں پر مجسم اشک ریز
وہ نوشیرواں اور زرتشت اور داریوش
وہ فرہاد و شیریں ، وہ کیخسرو و کیقباد
"ہم اِک داستاں ہیں وہ کردار تھے داستاں کے !
ہم اِک کارواں ہیں وہ سالار تھے کارواں کے !"
تہِ خاک جن کے مزار
تماشا گہہ لالہ زار !

تماشا گہہ لالہ زار ،

مگر نوحہ خوانی کی یہ سرگرانی کہاں تک ؟
کہ منزل ہے دشوار غم سے غم جاوداں تک !
وہ سب تھے کشادہ دل و ہوشمند و پرستار ربِ کریم !
وہ سب خیر کے راہ داں ، رہ شناس

ہمیں آج محسن کُش و ناسپاس!
وہ شاہنشہانِ عظیم
وہ پندارِ رفتہ کا جاہ و جلالِ قدیم
ہماری ہزیمت کے سب بے بہا تار و پُو تھے،
فنا اُن کی تقدیر، ہم اُن کی تقدیر کے نوحہ گر ہیں،
اُسی کی تمنا میں پھر سوگوار
تماشا گہہ لالہ زار!

تماشا گہہ لالہ زار،

عروس جواں سالِ فردا، حجابوں میں مستور
گرسنہ نگہ، زود کاروں سے رنجور
مگر اب ہمارے نئے خواب کابوس ماضی نہیں ہیں،
ہمارے نئے خواب ہیں، آدمِ نو کے خواب
جہانِ تگ و دو کے خواب!
جہاں تگ و دو، مدائن نہیں،
کاخ فغفور و کسریٰ نہیں

یہ اُس آدمِ نو کا ماوے نہیں
نئی بستیاں اور نئے شہریار
تماشاگہہ لالہ زار!

---

# خوابِ سحرگہی

زنجیر
سومنات
ویراں کشید گاہیں
نمرود کی خدائی
ایک شہر
انقلابی
سوغات
ظلم رنگ
طلسم ازل
سبا ویراں

# زنجیر

گوشۂ زنجیر میں
اِک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمنِ جاں، دشمنِ جاں ہی سہی —
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں —
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں —

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اِک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی

حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسین اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تُو نے جن کے حسنِ روز افزوں کی زینت کے لئے
سالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تارہائے سیم و زر
اُن کے مُردوں کے لئے بھی آج اِک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال!

شکر ہے دُنبالۂ زنجیر میں
اِک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگ زاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو! بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سُو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اِس ہنگام بادآورد کو
حیلۂ شبخوں بناؤ!

# سومنات

نئے سرے سے غضب کی سج کر
عجوزۂ سومنات نکلی
مگر ستم پیشہ غزنوی
اپنے حجلۂ خاک میں ہے خنداں!
وہ سوچتا ہے:
"بھری جوانی سہاگ لوٹا تھا میں نے اِس کا،
مگر مِرا ہاتھ
اس کی رُوحِ عظیم پر بڑھ نہیں سکا تھا،
اور اب فرنگی یہ کہہ رہا ہے
"کہ آؤ اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو

جس کے مالک تمہیں ہو
ہم مل کے نورِ کمخواب سے سجائیں!"
وہ جانتا ہے
وہ نورِ کمخواب چین و ماچین میں نہیں ہے
کہ جس کی کرنوں میں
ایسا آہنگ ہو کہ گویا
وہی ہو ستّارِ عیب بھی
اور پردہ ساز بھی وہی ہو!"

عجوزۂ سومنات کے اس جلوس میں ہیں
عقیم صدیوں کا علم لادے ہوئے برہمن
جو اک نئے سامراج کے خواب دیکھتے ہیں
اور اپنی توندوں کے بل پہ چلتے ہوئے مہاجن
حصولِ دولت کی آرزو میں بہ جبر عریاں
جو سامری کے فسوں کی قاتل حشیش پی کر
ہیں رہگذاروں میں آج پاکوب و مست و غلطاں

دف و دہل کی صدائے ولولہ زیر پرخروشاں!

کسی جزیرے کی کور وادی کے
وحشیوں سے بھی بڑھ کے وحشی،
کہ ان کے ہونٹوں سے خوں کی رالیں ٹپک رہی ہیں
اور ان کے سینوں پہ کاٹھ سر لٹک رہے ہیں
جو بن کے تاریخ کی زبانیں
سُنا رہے ہیں فسانۂ صد ہزار انسان!
اور ان کے پیچھے لڑھکتے لنگڑاتے آ رہے ہیں
کچھ اشتراکی،
کچھ ان کے احساں شناس ملّا
بجھا چکے ہیں جو اپنے سینے کی شمع ایقاں!
مگر سرِ راہ تک رہے ہیں
کبھی تو دہشت زدہ نگاہوں سے
اور کبھی یاس جانگزا سے
غریب و افسردہ دل مسلماں

جو سوچتے ہیں
کہ "اے خدا
آج اپنے آبا کی سرزمیں میں
ہم اجنبی ہیں،
ہدف ہیں نفرت کے ناوکِ تیز و جانستاں کے!"
منو کے آئیں کا ظلم سہتے ہوئے ہریجن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے دُزدِ شبِ زمستاں
وہ سوچتے ہیں!
"کہیں یہ ممکن ہے
بیچ ڈالے گا
ہم کو بردہ فروش افرنگ
اب اُسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پُرانے سیسے سے
آج بھی کو رہ کر ہیں سب ہم
جواب بھی چاہے

تو روک لے ہم سے نورِ عرفاں!"

ستم رسیدہ نحیف دہقاں
بھی اس تماشے کو تک رہا ہے
اُسے خبر بھی نہیں کہ آقا بدل رہے ہیں
وہ اس تماشے کو
طفلِ کمسن کی حیرتِ تابناک سے محض دیکھتا ہے!
جلوس وحشی کی آز سے
سب کو اپنی جانب بلا رہا ہے
کہ ربہ سومنات کی بارگاہ میں آ کے سر جھکاؤ!
مگر وہ حِسِّ ازل
جو حیواں کو بھی میسّر ہے
سب تماشائیوں سے کہتی ہے
"اس سے آگے اجل ہے
بس مرگِ لم یزل ہے!"
اسی لئے وہ کنارِ جادہ پر ایستادہ ہیں، دیکھتے ہیں!

مگر تماشائی کیا ہمیشہ یونہی کھڑے دیکھتے رہیں گے ؟
نہیں، وہ ساعت قریب ہے
جب وہ ربّہ سومنات کے اِس طلسم نازک کو
غزنوی بن کے نوچ ڈالیں گے
چاک کردیں گے
وہم وبیدادو زرپرستی کی سازشِ تازہ تر کا داماں !

---

# ویراں کشید گاہیں

مری کی ویراں کشیدہ گاہوں میں
اُس فتیلے کو ڈھونڈتا ہوں
جو شیشہ و جام و دست ساقی کی منزلوں سے
گذر کے جب بھی بڑھا ہے آگے
تو اُس سے اکثر غموں سے اجڑے ہوئے دماغوں
کے تیرہ گوشے
اَنا کی شمعوں کی روشنی سے جھلک اُٹھے ہیں!
مَیں اس فتیلے کے اس سرے پر،
کھڑا ہوں مجذوب کی نظر سے
مری کی ویراں کشیدگاہوں میں جھانکتا ہوں!

میں کامگاری کے انتہائی سرور سے کانپنے لگا ہوں
جہان بھر کے عظیم سیّاح آج تک یہ خبر نہ لائے
کہ نیل،
جو بے شمار صدیوں سے،
مصر کے خشک ریگ زاروں کو،
رنگ و نغمہ سے بھر رہا ہے
کہاں سے ہوتی ہے اس کی تقدیر کی روپہلی سحر ہویدا؟
میں آج ایسے ہی نیل کی وسعتوں
کی دہلیز پر کھڑا ہوں
کھنڈر جو صبحِ ازل کی مانند
ایستادہ ہیں،
اس یقیں سے،
کہ ابتدا ہی اگر ہیولائے انتہا ہے
تو انتہا بھی کبھی وہی نقطہ بن گئی ہے،
جہاں سے سالک ہو، اولیں بار جادہ پیما!
کھنڈر جو صبحِ ازل کی مانند دیکھتے ہیں،

یہ دیکھ کر مضمحل نہیں ہیں،
کہ ان کے آغوش کے فتیلے کی روشنی
سرد پڑ چکی ہے
وہ اس فتیلے کی
سرکشی کو بھی جانتے ہیں!

---

# نمرود کی خدائی

یہ قدسیوں کی زمیں
جہاں فلسفی نے دیکھا تھا، اپنے خواب سحر گہی میں،
ہوائے تازہ و کشت شاداب و چشمۂ جانفروز کی آرزو کا پرتو!
یہیں مسافر پہنچ کے اب سوچنے لگا ہے:
"وہ خواب کابوس تو نہیں تھا؟
— وہ خواب کابوس تو نہیں تھا؟—
اے فلسفہ گو
کہاں وہ رویائے آسمانی؟
کہاں یہ نمرود کی خدائی!
تو جال بنتا رہا ہے، جن کے شکستہ تاروں سے اپنے موہوم فلسفے کے

ہم اُس یقیں سے، ہم اُس عمل سے، ہم اُس محبت سے
آج مایوس ہو چکے ہیں!
کوئی یہ کس سے کہے کہ آخر
گواہ کس عدل بے بہا کے تھے عہد تاتار کے خرابے؟
عجم، وہ مرزِ طلسم و رنگ و خیال و نغمہ
عرب، وہ اقلیم شیر و شہد و شراب و خرما
فقط نوا سنج تھے در و بام کے زیاں کے؛
جو اُن پہ گذری تھی
اُس سے بدتر دنوں کے ہم صیدِ ناتواں ہیں!
کوئی یہ کس سے کہے:

در و بام،
آہن و چوب و سنگ و سیماں کے
حسن پیوند کا فسوں تھے
بکھر گیا وہ فسوں تو کیا غم؟
اور ایسے پیوند سے امید وفا کسے تھی!
شکستِ مینا و جام برحق،

شکستِ رنگِ عذارِ محبوب بھی گوارا
مگر ـــــ یہاں تو کھنڈروں کے،
[ـــ یہ نوعِ انساں کی
کہکشاں سے بلند و برتر طلب کے اجڑے ہوئے مدائن ـــ]
شکستِ آہنگِ حرف و معنی کے نوحہ گر ہیں!

میں آنے والے دنوں کی دہشت سے کانپتا ہوں
مری نگاہیں یہ دیکھتی ہیں
کہ حرف و معنی کے ربط کا
خوابِ لذّت آگیں بکھر چکا ہے،
کہ راستے نیم ہوشمندوں سے،
نیند میں راہ پو گداؤں سے
"صوفیوں" سے بھرے پڑے ہیں
حیات خالی ہے آرزو سے
ہماری تہذیب، کہنہ بیمارِ جاں بلب ہے!

---

# ایک شہر

یہ سب سے نیا، اور سب سے بڑا اور نایاب شہر
یہاں آکے رُکتے ہیں سارے جہاں کے جہاز
یہاں ہفت اقلیم کے ایلچی آکے گزرانتے ہیں نیاز
در آمد بر آمد کے لاریب چشموں سے شاداب شہر
یہ گلہائے شبوّ کی مہکوں سے محفل کی شمعوں سے "شب تاب شہر"
یہ اک بستر خواب شہر
یہ دیبا و سنجاب شہر

یہاں ہیں عوام اپنے فرماں رُوا کی محبت میں سرشار

بطیب دلی، قیدِ زنجیر و بندِ سلاسل کے ارماں کے ہاتھوں گرفتار
دیوانہ وار!
یہاں فکر و اظہار کی حریت کی وہ دولت لٹائی گئی
کہ اب سیم و زر اور لعل و گہر کی بجائے
بس الفاظ و معنی سے
اہلِ قلم کے، خطیبوں کے، اجڑے خزانے ہیں معمور
خیالات کا ہے صنم خانۂ نقش گر میں وفور
مغنی ہے فن کی محبت میں چور
سلاخوں کے پیچھے فقط چند شوریدہ سر بے شعور!

مسافت یہاں صدر سے تا بہ نعلین بس ایک دو گام
یہاں میزبان اور مہمان ہیں ایک ہی شہد کے جام سے شادکام
اگر ہیں برہنہ سرِ عام تو سب برہنہ
کہ یہ شہر ہے، عدل و انصاف میں
اور مساوات میں
اور اخوت میں

## مانندِ حمّام!

یہاں تخت و دیہیم ہوں یا کُلاہ و گلیم
ہے سب کا وہی ایک ربِّ کریم!

---

# انقلابی

"مورخ،" مزاروں کے بستر کا بارِ گراں،
عروس اُس کی نارس تمنّاؤں کے سوز سے
آہ بر لب
جدائی کی دہلیز پر، زلف درخاک، نوحہ کناں!
یہ ہنگام تھا، جب ترے دل نے اِس غمزدہ سے
کہا: "لاؤ، اب لاؤ، دریوزۂ غمزۂ جانستاں!"

مگر خواہشیں اشہبِ بادپیما نہیں،
جو ہوں بھی تو کیا
کہ جولانگۂ وقت میں کس نے پایا ہے
کس کا نشاں؟

یہ تاریخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا،
کہ تاریخ دانوں کے دامِ محبت میں پھنس کر
اندھیروں کی روحِ رواں کو اجالا کہیں
مگر پھر بھی تاریخ کے ساتھ
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟
جو آنکھوں میں اُس وقت آنسو نہ ہوتے،
تو یہ مضطرب جاں،
یہ ہر تازہ و نو بنو رنگ کی دلربا
تری اس پذیرائیِ چشم و لب سے
وفا کے سنہرے جزیروں کی شہزاد ہوتی،
ترے ساتھ منزل بمنزل رواں دواں!

اسے اپنے ہی زلف و گیسو کے دام ازل سے
رہائی تو ملتی

—

مگر تو نے دیکھا بھی تھا
دیدۂ تاتار کا حجرۂ تار
جس کی طرف تو اسے کر رہا تھا اشارے،
جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں ہے
جہاں چارسو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راہگیروں
کی بے انتہا استخواں ایسے بکھرے پڑے ہیں؟
ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پر فغاں! -

# سوغات

زندگی ہیزم تنورِ شکم ہی تو نہیں
پارۂ نانِ شبینہ کا ستم ہی تو نہیں
ہوسِ دام و درم ہی تو نہیں
سیم و زر کی جو وہ سوغات صبا لائی تھی
ہم سہی کاہ مگر کاہ رُبا ہو نہ سکی
دردمندوں کی خدا ہو نہ سکی
آرزو ہدیۂ اربابِ کرم ہی تو نہیں!

ہم نے مانا کہ ہیں جاروب کشِ قصرِ حرم
کچھ وہ احباب جو خاکسترِ زنداں نہ بنے
شبِ تاریکِ وفا کے مہِ تاباں نہ بنے

کچھ وہ احباب بھی ہیں جن کے لئے
حیلۂ امن ہے خود ساختہ خوابوں کا فسوں
کچھ وہ احباب بھی ہیں، جن کے قدم
راہ پیما تو رہے، راہ شناسا نہ ہوئے
غم کے ماروں کا سہارا نہ ہوئے!
کچھ وہ مردانِ جنوں پیشہ بھی ہیں جن کے لئے
زندگی غیر کا بخشا ہوا اسم ہی تو نہیں
آتشِ دیر و حرم ہی تو نہیں!

---

# طلسمِ رنگ

"یہ میں ہوں!"

"اور یہ میں ہوں!"

یہ دو میں ایک سیم نیلگوں کے ساتھ آویزاں
ہیں شرق و غرب کے مانند
لیکن مل نہیں سکتے!
صدائیں رنگ سے ناآشنا
اک تار اُن کے درمیاں حائل!
مگر وہ ہاتھ جن کا بخت،
مشرق کے جواں سورج کی تابانی
کبھی اُن نرم و نازک، برف پروردہ حسیں باہوں
کو چھو جائیں،

محبت کی کمیں گاہوں کو چھو جائیں۔
یہ ناممکن! یہ ناممکن!
کہ "ظلمِ رنگ" کی دیوار آن کے درمیاں حائل!

"یہ میں ہوں!"
"اور یہ میں ہوں"
انا کے زخم خوں آلودہ، ہر پردے میں،
ہر پوشاک میں عریاں،
یہ زخم ایسے ہیں جو اشکِ ریا سے سِل نہیں سکتے
کسی سوچے ہوئے حرفِ وفا سے سِل نہیں سکتے!

# طلسمِ ازل

مجھے پھر طلسمِ ازل نے
نئی صبح کے نور میں نیم وا،
شرم آگیں دریچے سے جھانکا!

میں اس شہر میں بھی،
جہاں کوئے و برزن میں بکھرے ہوئے
حسن و رقص و مے و نور و نغمہ
اُسی نقشِ صد رنگ کے خطِ محراب ہیں، تار و پو ہیں
کہ صدیوں سے جس کے لئے
نوعِ اِنساں کا دل، کان، آنکھیں
سب آوارۂ جستجو ہیں۔

میں اس شہر میں تھا پریشان و تنہا!

یہاں زندگی ہے اک آہنگ تازہ،
مسلسل مگر پھر بھی تازہ
یہاں زندگی لمحہ لمحہ، نئے، دمبدم تیز تر
جوش سے گامزن ہے۔
یہاں وہ سکوں، جس کے گہوارۂ نرم و نازک
میں پلتے ہیں ہم ایشیائی
فقط دور ہی دور سے خندہ زن ہے
مگر میں اسی شہر میں تھا پریشان و غمگین و تنہا!

پریشان و غمگین و تنہا
کہ ہم ایشیائی
جو صدیوں سے ہیں خواب تمکیں کے رسیا
یہ کہتے رہے ہیں:
ہمارا لہو زخم افرنگ کی مومیائی

ہمارے ہی دم سے جلالِ شہی، فرِّ کبریائی؛
پریشان و غمگین و تنہا
کہ ہم تا بکے اپنے اوہامِ کہنہ کے دلبند بن کر
یونہی عافیت کی پُر اسرار لذّت کے آغوش سے
نہ ہر نقدِ بر چپکے رہیں گے
ابھی اور کے سال دریوزہ گر بن کے جیتے رہیں گے!
اِسی سوچ میں تھا کہ مجھ کو
طلسمِ ازل نے نئی صبح کے نور میں نیم وا،
شرم آگیں دریچے سے جھانکا
مگر اِس طرح، ایک چشمک میں جیسے
ہمالہ و الوند کے سینۂ آہنی سے
محبت کا اِک بے کراں سیل بہنے لگا ہو
اور اِس سیل میں سب ازل اور ابد مِل گئے ہوں!

---

# سبا ویراں

سلیماں سر بزانو اور سبا ویراں
سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن
سبا آلام کا انبار بے پایاں!
گیاہ و سبزہ و گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنۂ باراں
طیور اس دشت کے منقار زیر پر
تو سرمہ در گلو انساں
سلیماں سر بزانو اور سبا ویراں!

سلیماں سر بزانو، ترش رو، غمگیں، پریشاں مو

جہانگیری، جہانبانی، فقط طرارۂ آہو،
محبت شعلہ پرّاں، ہوس بوئے گل بے بو
زِ راز دہر کمتر گو!

سبا دیراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
کسی عیار کے غارتگروں کے نقش پا باقی
سبا باقی نہ ماہروئے سبا باقی!

سلیماں سر بزانو
اب کہاں سے قاصد فرخندہ پے آئے؟
کہاں سے کس سبو سے کاسۂ پیری میں مے آئے؟

---

# شبابِ گریزاں

# شبابِ گریزاں

مئے تازہ وناب حاصل نہیں ہے
تو کرلوں گا دُردِ تہِ جام پی کر گذارا۔

مجھے ایک نورس کلی نے

یہ طعنہ دیا تھا،
نری عمر کا یہ تقاضا ہے
تو ایسے پھولوں کا بھونرا بنے
جن میں دو چار دن کی مہک رہ گئی ہو۔

یہ سچ ہے وہ تصویر،
جس کے سبھی رنگ دُھندلا گئے ہوں

نئے رنگ اس میں بھرے کون لاکر

نئے رنگ لائے کہاں سے ؟

ترے آسماں کا،

میں اک تازہ وارد ستارا سہی

جانتا ہوں کہ اس آسماں پر

بہت چاند، سورج، ستارے ابھر کر

جو اک بار ڈوبے تو ابھرے نہیں ہیں

فراموش گاری کے نیلے افق سے

انھی کی طرح میں بھی

ناتجربہ کار انساں کی ہمت سے آگے بڑھا ہوں!

جو آگے بڑھا ہوں

تو دل میں ہوس یہ نہیں ہے

کہ اب سے ہزاروں برس بعد کی داستانوں میں

زندہ ہو اک بار پھر نام میرا !

یہ شام دلآویز تو اک بہانہ ہے،

اک کوشش ناتواں ہے
شبابِ گریزاں کو جاتے ہوئے روکنے کی
وگرنہ ہے کافی مجھے ایک پل کا سہارا
ہوں اک تازہ وارد مصیبت کا مارا
میں کر لوں گا دُردِ تہِ جام پی کر گذارا —"

---

# حیلہ ساز

کئی تنہا برس گذرے
کہ اس وادی میں ان سرسبز او نچے کوہساروں میں
اٹھا لایا تھا میں اُس کو،
نظر آتا ہے گاڑی سے وہ سینے توریم اب بھی
جہاں اُس سے ہوئی تھیں آخری باتیں:
"تجھے اے جان، میری بے وفائی کا ہے غم اب بھی؟
"محبت اُس بھکارن سے؟
"وہ بے شک خوبصورت تھی،
"مگر اس سے محبّت، آہ ناممکن!
"محبت گوشت کے اس کہنہ و فرسودہ پیکر سے؟
"ہوسناکی؟
"میں اک بوسے کا مجرم ہوں
"فقط اک تجربہ منظور تھا مجھ کو

"کہ آیا مفلسی کتنا گرا دیتی ہے انساں کو!"

نہ آیا اعتماد اس کو مری اس حیلہ سازی پر
بس اپنی ناتواں دلدوز آنکھوں سے
پہاڑوں اور ان پر تند و سرافراختہ چیلوں
کو وہ تکتی رہی پیہم!
"یہ دیکھو ایک اونچے پیڑ کا ٹھنا
"پہاڑی میں بنا لی اس نے اپنی راہ یوں جیسے
"چٹان اس کے لئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی!"
زمانے بھر پہ تاریکی سی چھائی ہے
مگر وہ یاد کے روزن سے آتی ہے نظر اب بھی
مجھے بھولی نہیں وہ بے کسی اس کی نگاہوں کی
اور اُس کی آخری باتیں ہیں یاد اب تک!
مگر میں اس لئے تازہ "افق" کی جستجو میں ہوں
کہ اس کی یاد تک روپوش ہو جائے؟

---

# تہمت

مسخرے نے پھر سرِ جام شراب
مجھ پہ یہ تہمت لگائی ہے کہ میں
جان و دل سے آمریت کے ہوا خواہوں میں ہوں
اے حسودِ فتنہ پرور، جانتا ہوں کس لئے
میں ہدف اس ہرزہ اندیشی کا ہوں!

میں نہیں ہوں ہم پیالہ تیرا میخانوں میں کیا؟
شہر بھر میں خوبصورت عورتوں کی جستجو
رات دن کیا ل کے ہم کرتے نہیں؟
میں ترے ہمراہ ہر زینے پہ کیا ہوتا نہیں؟
ایک ہی روزن سے کیا

ہم نے مل کے بارہا جھانکا نہیں ؟
اور ہم تم دوستوں کی چشم پوشی کے طفیل
ان کے پوشیدہ شبستانوں کو گرماتے نہیں ؟
سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم دونوں غلام
روزگارِ سفلہ پرور کے کرم سے آج کل
زورِ بازو سے تگاپوئے شبانہ روز سے
کر رہے ہیں غیر کی تہذیب کو پائندہ تر
اس کے استبدادِ آدم سوز کو
دے رہے ہیں اک سہارا، اک دوام!
باوجود ان کارناموں کے بھی ہم
تو سمجھتا ہے کہ ہم مشرب نہیں
خیر خواہ نوعِ انساں ہے فقط دُنیا میں تو
اور اس منصب سے بے بہرہ ہوں میں
آستینِ دشنۂ پنہاں سے میں ڈرتا نہیں
ہاں مگر لرزاں ہوں اس نوحے سے

ان اشکِ نہنگانہ سے میں
جن کے وعدے سے تسلّی دے رہا ہے تو مجھے
اشتراکی مسخرے!

# کشاکش

شبِ دوشینہ کے آثار کہیں بھی تو نہیں،
تیری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ نہ رخساروں پر،
اُڑ گئی اوس کے مانند ہر انگڑائی بھی!
اور ترا دل تو بس اک حجلۂ تاریکی ہے،
اس میں کام آ نہیں سکتی مری بینائی بھی!

یہ تجسّس مجھے کیوں ہے کہ سحر کے ہنگام
کون اُٹھا ترے آغوش سے سرجوشِ جوانی لے کر
کیا وہ اس شہر کا سب سے بڑا سوداگر تھا؟
[تیرے پاؤں میں ہے زنجیرِ طلائی جس کی]

یا فرنگی کا گرانڈیل سپاہی تھا کوئی؟

[جن سے یہ شہر اُبلتا ہوا ناسور بنا جاتا ہے]

یا کوئی دوست، شب و روز کی محنت کا شریک؟

[میرے ہی شوق نے ترغیب دلائی ہو جسے!]

یہ تجسّس مجھے کیوں ہے آخر،

جبکہ خود میرے لئے دُور نہ تھا، دُور نہیں،

کہ میں چاہوں تو ترے جسم کے خمخانوں کا محرم بنجاؤں؟

جس کی قسمت میں کوئی موجِ تبسّم بھی نہ ہو،

قہقہوں کا اُسے ذخّار سمندر مل جائے،

مبتلا کیوں نہ وہ اوہام کے اس دام میں ہو،

کہ وہی ایک وہی ہے تری ہستی پہ محیط

اور تو عہدِ گذشتہ کی طرح

کاروانہائے تمنّا کی گذرگاہ نہیں!

شب دوشینہ کے آثار کہیں بھی تو نہیں،

تیری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ نہ رخساروں پر،
اور نمودار بھی ہو جائیں تو کیا،
آگہی ہو بھی، تو حاصل نہیں کچھ اس کے سوا
کہ غمِ عشق چراغِ تہ داماں ہو جائے،
زندگی اور پریشاں ہو جائے!

---

# خرابے

اِک تمنّا تھی کہ میں

اِک نیا گھر، نئی منزل کہیں آباد کروں

کہ مرا پہلا مکان

جس کی تعمیر میں گذرے تھے مرے سات برس

اِک کھنڈر بنتا چلا جاتا تھا

یہ تمنا تھی کہ شوریدہ سری

خشت اور سنگ کے انبار لگاتی ہی رہے

روز و شب، ذہن میں بنتے ہی رہیں

در و دیوار کے خوش رنگ نقوش

مجھ کو تخئیل کے صحرا میں لئے پھرتا تھا

ایک آفت زدہ دیوانے کا جوش
لے گئے میرے قدم آخرِ کار
ایک دن اپنے نئے گھر میں مجھے
خیر مقدم کو تھیں موجود جہاں
میری گل چہرہ کنیزیں، مرے دل شاد غلام
دیکھ کر اپنی تمناؤں کی شادابی کو
میرے اندیشے کی دہلیز سے معدوم ہوئے
میرے ماضی کے سیہ تاب، الم ناک نشاں!

یہ مگر کیا تھا، خیالات تھے، اوہام تھے دیوانے کے
نہ وہ گل چہرہ کنیزیں تھیں نہ دل شاد غلام
در و دیوار کے وہ نقش نہ دیواریں تھیں
سنگ اور خشت کے ڈھیروں پہ تھا کائی کا نزول
اور وہ ڈھیر بھی موجود نہ تھے
گھل گئے تھے کسی آئندہ کی بیداری میں
میرے خود ساختہ خواب

میں اسی پہلے خرابے کے کنارے تھا نگوں
جس سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے !
کس لئے ہے مری محرومی کی حاسد اب بھی
کسی منحوس ستارے کی غضبناک نگاہ
اور ادھر بندۂ بدبخت کی تنہائی کا یہ رنگ — کہ وہ
اور بھی تیرہ و غمناک ہوئی جاتی ہے !

# سرگوشیاں

"پھر آج شام گاہ سرِ رہگذار اسے
دیکھا ہے اس کے دوشِ حسیں پر جھکے ہوئے!"

"یارو وہ ہرزہ گرد،
ہے کسبِ روزگار میں اپنا شریکِ کار،
راتوں کو اس کی راہگذاروں پہ گردشیں
اور میکدوں میں چھپ کے مے آشامیٔ طویل
رسوائیوں کی کوئی زمانے میں حد بھی ہے!"

"یہ غصّہ رائگاں ہے ہمیں تو ہے یہ گلہ

وارفتہ کیوں اسی کے لئے ہے وہ عشوہ سازؔ
کیوں اتنی دلکشی بھی خدا نے نہ دی ہمیں
تسخیر اُس کا خندۂ بیباک کر سکیں ؟"

"اب تو کسی نوید کا امکان ہی نہیں
جب اس کا، دل کی آرزوؤں کے حصول تک
ایک اپنے یارِ غار سے ہے ربط شرمناک
اِک رشتۂ ذلیل"

"یہ اس کی شاطری ہے کہ "زلفِ عجم" کا دام"؟

"کچھ بھی ہو اس میں شائبۂ شاعری نہیں
برسوں کا ایک ترسا ہوا شخص جان کر
پہچانتی ہے دُور سے عورت کی بو اُسے"

"اور کر رہا ہے اس کا نصیبہ بھی یاوری!"

اس رشکِ بے بسی سے مرے دوست فائدہ ؟
ہے کچھ تو اپنا زور گریباں کے چاک پر
حاصل نہیں ہے ہم کو اگر وہ شرابِ ناب
تو بام و در کی شہر میں کوئی کمی نہیں
دو پول، ایک پکیہ تخ بستہ، ایک رات "

---

# رقص کی رات

رقص کی رات کسی غمزۂ عریاں کی کرن
اس لئے بن نہ سکی راہِ تمنا کی دلیل
کہ ابھی دُور کسی دیس میں اِک ننھا چراغ
جس سے تنویر مرے سینۂ غمناک میں ہے
ٹمٹماتا ہے اس اندیشے میں شاید کہ سحر ہو جائے
اور کوئی لوٹ کے آ ہی نہ سکے!

رقص کی رات کوئی دورِ طرب
بن نہ سکتا تھا ستاروں کی خدائی گردش؟
محورِ حال بھی ہو، جادۂ آئندہ بھی
اور دونوں میں وہ پیوستگیٔ شوق بھی ہو
جو کبھی ساحل و دریا میں نہ تھی؟

پھر بھی حائل رہے یوں بُعدِ عظیم
لب ہلیں اور سخن آغاز نہ ہو
ہاتھ بڑھ جائیں مگر لامسہ بے جان رہے؟

تجھے معلوم نہیں،
اب بھی ہر صبح دریچے ہیں سے یوں جھانکتا ہوں
جیسے ٹوٹے ہوئے تختے سے کوئی تیرہ نصیب
سخت طوفان میں حسرت سے اُفق کو دیکھے:
"کاش اُبھر آئے کہیں سے وہ سفینہ جو مجھے
اس غمِ مرگِ تہ آب سے آزاد کرے!"

رقص کی شب کی ملاقات سے اتنا تو ہوا
دامنِ زیست سے میں آج بھی وابستہ ہوں
لیکن اِس تختۂ نازک سے یہ اُمّید کہاں
کہ یہ چشم ولبِ ساحل کو کبھی چوم سکے!

# آواز

—— یہ دلّی ہے

اپنے غریب الوطن بھائیوں کے لئے

ہار غزلوں کے لائی ہے اُن کی بہن،

اور گیتوں کے گجرے بنا کر

"چھما چھم چھما چھم دلہنیا چلی رے"

"یہ دُنیا ہے طوفان میل"

"اے مدینے کے عربی جواں"

"تیری زلفیں ہمیں ڈس گئیں ناگ بن کر" ——

مگر اس صدا سے بڑا ناگ ممکن ہے

جو لے گیا ایک پل میں

ہزاروں کو غارِ فراموشگاری
میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے
کہ صدیاں گذرنے پر اُن کی
سیہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی؟

جہاں سے یہ آواز آئی
اسی سرزمیں میں
سمندر کے ساحل پہ لاکھوں گھروں میں
دیئے ٹمٹمانے لگے
اور اک دوسرے سے
بہت دھیمی سرگوشیوں میں
یہ کہنے لگے،
"سنو اب سحر ہونے والی ہے لیکن
مسافر کی اب تک خبر بھی نہیں ہے۔"

---

# دُوری

مجھے موت آئے گی، مر جاؤں گا میں
تجھے موت آئے گی مر جائے گی تو
وہ پہلی شب مہ شب ماہ دو نیم بن جائے گی
جس طرح سازِ کہنہ کے تارِ شکستہ کے دونوں سرے
دو افق کے کناروں کے مانند
بس دُور ہی دُور سے تھرتھراتے ہیں اور پاس آتے نہیں ہیں
نہ وہ راز کی بات ہونٹوں پہ لاتے ہیں
جس نے مغنّی کو دورِ زمان و مکاں سے نکالا تھا۔
بخشی تھی خوابِ ابد سے رہائی!

یہ سچ ہے تو پھر کیوں
کوئی ایسی صورت، کوئی ایسا حیلہ نہ تھا
جس سے ہم آنے والے زمانہ کی آہٹ کو سن کر

وہیں اس کی یورش کو سینوں پہ یوں روک لیتے۔
کہ ہم تیری منزل نہیں۔ تیرا ملجا و ماوئی نہیں ہیں؟
یہ سوچا تھا شاید
کہ خود پہلے اس بُعد کے آفرینندہ بن جائیں گے
[اب جو اک بحرِ خمیازہ کش بن گیا ہے]۔
تو پھر از سرِ نو مسرّت سے، نورس نئی فاتحانہ مُسرّت سے
پائیں گے بھولی ہوئی زندگی کو!
وہی خود فریبی وہی اشک شوئی کا ادنیٰ بہانہ!

مگر اب وہی بُعد سرگوشیاں کر رہا ہے
کہ تو اپنی منزل کو واپس نہیں جا سکے گا۔
نہیں جا سکے گا۔ . . .
مجھے موت آئے گی، مر جاؤں گا میں
تجھے موت آئے گی مر جائے گی تُو
مگر مجھ کو اس کا یقیں ہے
یہ عفریت پہلے ہزیمت اٹھائے گا مٹ جائے گا!

# سایہ

کسی خواب آلودہ سایے کا پیکر
کہاں تک ترے گوشِ شنوا، تری چشمِ بینا، ترے قلبِ دانا
کا ملجا و ماویٰ بنے گا؟

تجھے آج سایے کے ہونٹوں سے حکمت کی باتیں گوارا
تجھے آج سایے کے آغوش میں شعر و نغمہ کی راتیں گوارا
گوارا ہیں اُس زندگی سے کہ جس میں کئی کارواں راہ پیما رہے ہیں۔

مگر کل ترے لب پہ پہلی سی آہوں کی لپٹیں اٹھیں گی
ترا دل اُنہی کاروانوں کو ڈھونڈے گا

اُن کو پکارے گا
جو جسم کی چشمہ گاہوں پہ رُکتے ہیں آکر
جنہیں تشنگی کے لئے سیرابی کی پوشیدہ راہوں
کی ساری خبر ہے!

یہ تسلیم، سایے نے تجھ کو
وہ پہنائیاں دیں
افق سے بلند اور بالا
جو تیری نگاہوں کے مرئی حجابوں میں پنہاں رہی تھیں!
وہ اسرار تجھ پر ہویدا کئے جن کا ارمان
فلاطوں سے اقبال تک سب کے سینوں کی دولت رہا ہے۔
وہ اشعار تجھ کو سُنائے۔ جو حاصل ہیں ورجل سے لے کر
سبک مایہ راشد کے سوز دروں کا
کہ تو بھول جائے وہ صرصر وہ گرداب جن میں
تری زندگی وہ اژگوں تھی
تری زندگی خاک و خون تھی!

تو اُسرار و اشعار سنتی رہی ہے
مگر دل ہی دل میں تو ہنستی رہی ہے
تو سیّال پیکر سے، سایے سے، غم کے کنائے سے کیا پا سکے گی؟
جب اس کے وَرا، اِس سے زندہ توانا بدن
رنگ و لذت کے مخزن، ہزاروں،
تمنا کے مامن ہزاروں!
کبھی خواب آلودہ سائے کی مہجور و غم دیدہ آنکھیں
ترے خشک مژگاں کو رنجور و نم دیدہ کرتی رہی ہیں
تو پھر بھی تو ہنستی رہی ہے!

# کونسی اُلجھن کو سُلجھاتے ہیں ہم؟

لب بیاباں، بوسے بے جاں
کونسی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم
جسم کی یہ کارگاہیں
جن کا ہیزم آپ بن جاتے ہیں ہم!

نیم شب اور شعر خواب آلودہ، ہم سایے
کہ جیسے دُزدِ شب گرداں کوئی!
شام سے تھے حسرتوں کے بندۂ بے دام ہم
پی رہے تھے جام پر ہر جام ہم
یہ سمجھ کر، جرعۂ پنہاں کوئی
شاید آخر، ابتدائے راز کا ایما بنے!

---

مطلب آساں، حرف بے معنی
تبسم کے حسابی زاویے
متن کے سب حاشیے
جن سے علیشِ خام کے نقشِ ریا بنتے رہے
اور آخر جسم میں کیدِ سرِ مُو بھی نہ تھا
جب دلوں کے درمیاں حائل تھے سنگیں فاصلے
قربِ چشم و گوش سے ہم کونسی اُلجھن کو سلجھاتے رہے!

کونسی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟
شام کو جب اپنی غم گاہوں سے دُزدانہ نکل آتے ہیں ہم؟
زندگی کو تنگنائے تازہ تر کی جستجو
یا زوالِ عمر کا دیو سبک پا رو برو
یا انا کے دست و پا کو وسعتوں کی آرزو
کونسی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟

---

# غزلیات

۱

کس کو یارا ہے کہ اُس ماہ جبیں تک پہنچے
دُشمنِ جان و دل و دولت و دیں تک پہنچے

نہ سہی ماہ کی منزل، نہ سہی عرش کا در
چلو اتنا تو ہُوا، یار کہیں تک پہنچے

چاک دامن بھی وہی، چاک گریباں بھی وہی
اب وہ الہام کہاں ہے جو زمیں تک پہنچے

مل سکی ایک بھی سجدے کی نہ خیرات اُنہیں
آستاں چل کے بہت اپنی جبیں تک پہنچے

یہ کرامات بھی صدیوں میں کبھی ہوتی ہے
رازِ مے خانہ کسی راہ نشیں تک پہنچے

نہ امیدوں کی جوانی، نہ تمنا کا سرور
اب اگر تیری صدا قلبِ حزیں تک پہنچے!

کیا خبر تھی کہ منازل ہیں ابھی اس سے پرے
ہم بڑھے بھی تو توہّم سے یقیں تک پہنچے

زندگی دے کے ملی آگہیٔ رازِ وجود
جو مکاں سے نکل آئے تو مکیں تک پہنچے

سینکڑوں رطلِ گراں غم کے چڑھا کر راشدؔ
یہ تمنّا ہے کہ ہر جام ہمیں تک پہنچے

## ۲

زندگی کیسے کٹی ان کی بلا کو معلوم
مجھ کو معلوم ہے یا میرے خدا کو معلوم

گلِ پژمردہ تجھے اس کی خبر ہو شاید
دردِ غنچے کا نہیں بادِ صبا کو معلوم

وہ جو چاہے تو کبھی شعلہ بھی بن سکتی ہے
کاش ہو جائے یہ مطرب کی صدا کو معلوم

کس پہ کرتے ہو محلّات کے دروازے بند
خلوتِ شاہ کا ہر راز گدا کو معلوم!

آج کیوں پچھلے پہر دل پہ پڑی ہے دستک
ہو گئی اپنی خبر صبحِ بلا کو معلوم

کیا ہوا آپ نے گر ہم سے بدل لی آنکھیں
گردشیں اور بھی ہیں صبح و مسا کو معلوم

یورشِ عشق سے تھا اُس کو مفر اے راشد
حجرۂ تار کے روزن تھے ضیا کو معلوم

۳

سرشکِ خوں سے ہے روئے نگار پر غازہ
اُٹھے گا مشرق و مغرب سے فتنۂ تازہ

سبو و جام میں جن کا لہو نہیں کے لئے
ہے آج بند سرائے مُغاں کا دروازہ

یہ ڈر ہے کوچہ و بازار میں نہ رسوا ہو
چلی تو حجلۂ انگور سے ہے جنازہ!

۴

زہرِ غم کی نگہِ دوست بھی تریاک نہیں
حیا ترے درد کا درماں دلِ صدچاک نہیں

ساغرِ مے نہ سہی، دُردِ تہِ جام قبول
خاک جو ہم نفسِ بادہ رہی خاک نہیں

اُف قیامت، ہے انہیں بھی ہوسِ راہگذار
جن کا اپنا کوئی ثانی تہِ افلاک نہیں

بحرِ صہبا کے شناور تو بہت ملتے ہیں ——
اشکِ خوں کا مگر اے دل کوئی پیراک نہیں

یہ نصیبہ کہ ہم آزاد رہیں طرّۂ یار
اب گرہ میں تری شاید کوئی بیباک نہیں

وہ آئے خواب میں یوں بے صدا چلے جیسے
کنارِ کوثر و تسنیم روحِ گل چینی
ہے ہم فسردہ دلوں کی نظر کی نقش گری
رخِ نگار کی سب آب و تاب و رنگینی
میں شعرِ نو کا خدا ہی سہی مگر راشد
مری غزل بھی ہے ان کے حضور لاطینی!

## ۶

یگانہ مونسِ حال تباہ بن کے رہی
شراب دل زدگاں کی پناہ بن کے رہی

ہم اُس کا تذکرہ یوں بار بار کرتے رہے
شبِ گناہ کی لذّت گناہ بن کے رہی

بہار نور و گل و نغمہ بن کے آئی تھی
شرارِ غم کے لئے مشت کاہ بن کے رہی

شبِ وصال جُدائی کا وہ خیال رہا
کہ وہ بھی ہجر کا روز سیاہ بن کے رہی

اُسی نے خودنگری کا یہ حوصلہ بخشا
کسی کی کم نگہی بھی نگاہ بن کے رہی

اُسی ایک راہ سے کارواں ہیں نکل کے آج رواں دواں
کھلا رہ گیا تھا الست میں کہیں ایک طاق درِ جنوں

نہ تو اُس کے ہاتھ میں موقلم نہ تو واسطہ اُسے رنگ سے
فقط ایک پارۂ سنگ سے ہے کمالِ نقش گرِ جنوں

ہے وہ مبتلائے غم و تعب ہے مرے لئے وہ دعا طلب
مرے انتظار میں روز و شب ہے نگارِ خود نگرِ جنوں

تھا عجیب راشدِ بے نوا، وہ سرورِ دولتِ بے بہا
ہوا ہم پہ جب گذرِ جنوں، پڑی ہم پہ جب نظرِ جنوں

---